چندے کا پھول

مصنفہ

و۔ ب سدید

پہلی بار تعداد ایک ہزار

قیمت [illegible] آنے

چندے کا پھول

مصنّفہ

و۔ ب۔ سدید

دین پرنٹنگ پریس نبل روڈ لاہور باہتمام مرزا محمد صادق چھپی اور
و۔ب۔سدید نے ۱۳ اقبال سٹریٹ سعدی پارک لاہور سے شائع کی

لندن سیدھی گلی

میری مکان کے اوپر کے حصہ میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی ہے۔ نچلے حصّے سے بوڑھی مکان دار مارتھا نے آ کر کہا۔

"صبح بخیر میری!"

میری چونک گئی اور سر اُٹھا کر کہا

"صبح بخیر!"

مارتھا:۔ شاید کوئی دلچسپ خبر پڑھ رہی ہو؟"

میری:۔ بیٹھو مارتھا میں کیپٹن ٹامکھن کی تعریف دیکھ رہی ہوں۔"

مارتھا:۔ جو نوجوان بہادری دکھائیں گے ان کی تعریفیں کیوں نہ ہونگی میری؟"

میری:۔ اور جو تعریف کر لے گا ماس کا ذکر اس کے واقف، دوست یا عزیز کریں گے ہی؟"

مارتھا:" کیا ہمارا کوئی واقف بہادری دکھا رہا ہے؟"

میری:" ٹام کی یاد بھول گئیں۔"

مارتھا:" ٹام کھونا۔ میں اس کی یاد کیونکر بھول سکتی ہوں میری۔ مگر تم نے تو کچھ اور نام لیا تھا۔"

میری:" میں نے جوش میں کیپٹن ٹامکمن کہہ دیا تھا۔ وہ اب کیپٹن ہے اس کی تعریف بہت لکھی ہے۔ ہر دل عزیز، محنتی، بہادر اور سجیلا جوان ـــــ آہ! اس کا باپ بھی ایسا ہی تھا۔ خدا ٹام کو زندگی بخشے۔"

مارتھا:" جلدی ہی اس کو ترقی ملی ہے۔ میرا کہا یاد رکھنا۔ پیارا ٹام اور درجے بھی جلدی جلدی طے کرے گا۔ ابھی بچہ ہی تو ہے۔"

میری:" میں اس سے ملنا چاہتی ہوں مارتھا۔"

مارتھا:" سٹرن۔ سنو میری۔ تمہارے پاس معمولی اچھا لباس بھی تو نہیں ہے۔ کیا پہن کر جاؤ گی؟"

میری:" اس کے پاس نہیں جاتی۔ اسے یہاں بلواؤں گی۔"

مارتھا:" اس کا آنا مشکل ہی سمجھو کیسے آسکتا ہے؟"

میری:" میرا جی چاہتا ہے اسے دیکھوں اس کے ساتھ باتیں کروں میں اسے چٹھی لکھوں گی ضروری باتیں کہنی ہیں مجھ سے آکر ملو۔"

مارتھا تھوڑی دیر سوچ کر بولی۔

"اس طرح شاید وہ آجائے۔ کل اتوار بھی ہے۔ منٹا کو بھی بلا لو۔ وہ تمہاری سنجیدہ باتوں میں کسی کسی وقت خوشگواری پیدا کر دیا کرے گی۔"

میری: "اس صلاح کا شکریہ۔ شام کو لکھ بھی دوں گی۔ منٹا بھی کل یہیں ہو گی۔"

مارتھا۔ "منٹا اسے یاد تو ہو گی۔"

میری: "خط میں ذکر کروں گی۔ نہ یاد ہو گی تو یاد کرانے سے یاد آجائے گی۔"

مارتھا تھوڑی دیر میں نیچے چلی گئی اور میری خط لکھنے بیٹھ گئی۔ دونوں خط لکھکر بند کئے اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لباس ٹھیک کیا اور خط لیکر نیچے اتر گئی۔ وہ خطوط ڈالنے جا رہی تھی اور مارتھا اسے میٹھی میٹھی پُرحسرت نظروں سے تکتی رہ گئی۔ جب میری باہر نکل گئی تو مارتھا کے منہ سے نکلا "بے چاری۔"

ٹامکنسن ہتھیاروں کی دیکھ بھال سے فارغ ہو کر اپنے نیچے کے سپاہیوں کو ابھارتے ہوئے بولا۔

"عزیزو! مجھے تم لوگوں سے اوپر کیا گیا ہے۔ تو یہ ایک قاعدہ ہے ورنہ ہم سب ایک ہیں۔ ہمارا آپس میں سگے بھائیوں کا رشتہ ہے۔ ہم

گورنمنٹ کے عزیز بچے ہیں اور ہمارا باپ آسمانی باپ ہے میں محسوس کرتا ہوں۔ اب مجھے اپنی جان سے زیادہ تمہاری جانوں کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھانی ہے۔ اس وقت ہماری عزت اور آزادی خطرے میں ہے۔ اس لئے ہمیں گورنمنٹ کے سپوت بن کر۔ اپنے سینے تان کر میدان میں ڈٹ کر عزت بچانی ہے۔ مثل ہے "مال صدقہ جان۔ اور جان صدقہ آبرو۔" بہادر دا! مجھے یقین کامل ہے کہ آپ سب بھی میری طرح ضرور خوش ہیں۔ اس لئے کہ ہماری مرادوں کے دن آگئے ہیں۔ میدان جنگ سپاہی کی زندگی کا معراج ہے۔ خدا بادشاہ کو سلامت رکھے۔ سب کہتے ہیں

"خدا بادشاہ کو سلامت رکھے"

ٹھاکھن اپنے کمرے میں پہنچا تو ڈاک اس کی میز پر رکھی تھی۔ ایک خط زنانہ تحریر کا دیکھکر وہ کچھ حیران سا ہوا۔ کھول کر دیکھا۔ تحریر یہ تھی۔

"میرے عزیز تمہیں ترقی ملی ہے۔ یہ خبر پاکر مجھے بہت خوشی ہوئی اور دل سے تمہارے لئے دعا نکلی۔ جب تم چھوٹے تھے۔ میں کبھی کبھی تمہارے اسکول پہنچا کرتی تھی اور بچوں میں مٹھائی بھی بانٹا کرتی تھی شاید تمہیں یاد ہو۔ میرے ساتھ ایک چھوٹی لڑکی بھی ہوا کرتی تھی۔

جس کا نام ایرامنٹا ہے۔ تم دونوں خوش خوش آپس میں کھیلا کرتے تھے۔ میرے عزیز میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ اور کچھ ضروری باتیں کہنا چاہتی ہوں۔ کل اتوار ہے۔ میں بھی چھٹی پہ ہونگی۔ منٹا بھی آئیگی کیا آپ دوپہر سے پہلے میرے گھر آئیں گے۔ میں منتظر ہوں گی۔ آپ منٹا سے بھی مل کر یقیناً خوش ہوں گے۔ میرا پیار تم کو۔ فقط

میری۔ سیدھی گلی نمبر ۲۱"

یہ خط پڑھکر وہ سوچ میں ہو گیا۔ سامنے سے اس کا دوست کیپٹن ڈاسن چلا آرہا تھا۔ اسے اس طرح بیٹھے دیکھکر اس نے پوچھا

"کیا بات ہے ٹام؟"

ٹام نے خط کی طرف اشارہ کیا۔ جو ابھی تک میز پر کھلا پڑا تھا۔

ڈاسن نے خط اٹھا لیا۔ خط پڑھکر اس نے کہا۔

"خدا کی دین ہے۔ بغیر کوشش کئے گھر بیٹھے بلاوے آنے لگے ہمیں کوئی نہیں پوچھتا کسی بات میں تم سے کم بھی نہیں ہوں۔"

ٹام "کیا خبر بات ہے کیا۔ طرز تحریر سے میری عمر رسیدہ معلوم ہوتی ہے۔ ہاں منٹا میری ہم عمر ہے۔ تو اب جوان ہو گی۔ مگر وہ تو دیں تیسری شخصیت کا حصہ پورا کرنے کو بڑھیا نے بلوائی ہو گی۔"

ڈاسن "نہیں دوست منٹا ہی نے تمہیں بلوایا ہے۔ بڑھیا بیچ میں

یوں ہی کو د رہی ہے "

ٹام :- میں ایسا نہیں سمجھتا "

ڈاسن :- ایسے بے مغز تو نہیں ہو ۔ معلوم نہیں کیوں صاف بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ۔ بڑھیا یقیناً تیسری شخصیت ہے وہ منشا کی تعریف تم سے ، اور تمہاری اس کے پاس کر سکتی ہے ۔"

ٹام :- میں بے مغز نہ سہی ۔ تم بے مغز سہی ۔"

ڈاسن نے غصے میں آ کر میز پر ہاتھ مار کر کہا ۔

" اس وقت میں تم سے نیچے کے درجے میں ہوتا تو تمہارے عہدے پر قبضہ جما کر پوچھتا :- اب بھی مجھے بیوقوف جانتے ہو "

ٹام نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

" خیریت رہی ۔ دونوں کو ایک ساتھ ترقی ملی ۔ مگر دوست تمہارا یہ زعم کہ ہم دونوں کی شکل ایک سی ہے ۔ صحیح تو نہیں "

ڈاسن :- کسی موقعہ پر ثابت کر دوں گا ۔ بے فکر رہئیے ۔"

ٹام :- اچھے دوست ہو ۔ نہ صلاح نہ مشورہ ۔ میں سوچ رہا تھا ۔ مجھے ایسی گلیوں میں جانا بھی چاہئیے یا نہ ۔"

ڈاسن نے اس کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھا اور مسکراتے

ہوئے کہا

"میری دوست مجھے دوزخ میں بھی بلواتی تو میں سر کے بل جاتا۔"

ٹام۔ "یہی مشکل ہے۔ منٹا میری دوست نہیں۔ شاید اب میں اسے پہچان بھی نہ سکوں۔ آہا بینڈ!! بینڈ!!!

بینڈ کی آواز سن کر دونوں ناچتے اور بینڈ کی طرز کے ساتھ اپنی آوازیں ملاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

میری انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہے۔ منٹا کے آنے پر بھی وہ اسی طرح اُداس بیٹھی اخبار کے ورق پلٹتی رہی۔ ایک آدھ بات آپس میں ہوتی۔ پھر وہی خاموشی۔ منٹا نے کئی طرح کے مضمون بدلے میری نے کسی میں دلچسپی نہ لی۔ آخر منٹا نے ہار کر کہا

"آج آپ کچھ اُداس ہیں خالہ؟"

میری چونکی اور کہا۔

"ہاں منٹا میں کچھ سوچ رہی ہوں۔ آج میں کسی اور کی انتظار میں بھی ہوں۔ تم ایک کام کرو۔ آج مجھے پڑھو۔ وقت بھی اچھا کٹ جائے گا اور تفریح بھی ہو گی۔ تم آدمی کو بہت اچھا پڑھنا جانتی ہو۔"

منٹا: "خدا جانے پہچانے آدمی کا پڑھنا مشکل ہے خالہ۔ جسے آدمی بالکل نہ جانتا ہو۔ اسے اچھی طرح پڑھ سکتا ہے۔"

میری: "تم مجھے سوائے اس کے بالکل نہیں جانتیں کہ میرا تمہاری ماں سے میل جول ہے اور تم سے میں پیار کرتی ہوں۔"

منٹا نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ سچ ہے۔"

پھر منٹا نے میری کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ تھوڑی دیر میں اس نے کہا۔

"آپ کی آنکھوں کی پتلیوں کے پیچھے بہت سے تکلیف دہ راز ہیں۔"

میری: "ہوں۔"

منٹا: "آپ میں ایک عادت ایسی ہے۔ جو طبیعت ثانی بن چکی ہے۔ وہ عادت یہ ہے۔ آپ جو ارادہ کریں۔ کسی کے کہے سُنے اس سے باز نہیں آئیں گی۔ گو مشورہ میں کسی ایک کو شریک کر لیں۔ مگر بات اپنی ہی رکھیں گی۔"

میری: "اور کہو۔"

منٹا: "ایک اور عادت ہے۔ آپ کسی نقصان کی زیادہ پروا نہیں کرتیں۔

کوئی چیز آپ سے چھن جائے۔ جس سے آپ کو انتہائی صدمہ پہنچے
اس حالت میں بھی آپ حواس پر قابو رکھیں گی۔ اور نتیجہ کی
اچھائی یا برائی کی پروا کئے بغیر اس نقصان کی تلافی کی پوری
کوشش کریں گی۔ نتیجہ اچھا ہو تو خاص خوشی نہیں۔ بُرا ہو
تو زیادہ رنج نہیں۔"

میری:- "میں نہ کہتی تھی تم آدمی کو بہت اچھا پڑھ لیتی ہو۔ اچھا اور بتاؤ۔"

منتا:- "آپ میں ایک یہ عادت ہے کہ جب کوئی کام اپنے ذمہ لگا لیں۔
تو اپنا آپا بھی بھول کر اس کام کو انجام دیں گی۔ سخت محنت میں
بشاش رہنا آپ کا معمول ہے۔ ذمہ داری کے کام میں آپ بیماری
کو بھی حارج نہیں ہونے دیں گی۔"

میری:- "منتا میری اچھائیاں ہی نہ گنواؤ۔ انسان میں عیب بھی
ہوتے ہیں۔"

منتا مسکرانے لگی اور کہا۔

"ہر اچھی تعریف بد تعریفی بھی گنی جا سکتی ہے خالہ۔"

میری:- "ہاں میں سمجھ گئی۔ مجھے خود رَو بھی کہا جا سکتا ہے۔ لاپروا بھی۔
اچھا اور کہو۔"

منتا:- "محبت میں آپ ایک سے زیادہ دفعہ ناکام رہی ہیں۔ یہ کچھ ضروری

نہیں۔ کہ آپ کی ہر ایک محبت جسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا وہ شادی ہی سے متعلق ہو۔ اس وقت بھی آپ محبت کے جذبے کو جی میں دبائے ہوئے ہیں"

میری: "تم ٹام کو تو جانتی ہو منٹا۔ وہ چھوٹا لڑکا جو فوجی سکول میں پڑھتا تھا۔ تم میرے ساتھ اسکول جاتی تھیں اور ٹام کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں"

منٹا: "ہاں یاد ہے۔ اب تو وہ بھی بڑا ہو گیا ہوگا۔ کہاں ہے وہ؟"

میری: "وہ اب جوان ہے۔ کیپٹن بن گیا ہے۔ میں نے اسے بلوایا ہے امید ہے وہ بھی آج آئے"

منٹا: "کیا آپ اس سے اب بھی محبت کریں گی۔ اب وہ بچہ تو نہیں۔ اب وہ شاید آپ سے محبت نہ کر سکے"

میری: "ابھی تم نے کہا تھا میں شادی ہی کے خیال سے محبت نہیں کیا کرتی۔ وہ جوان ہے تو کسی اپنی ہم عمر کے لئے۔ میرے لئے وہ اب بھی بچہ ہی ہے"

منٹا کھسیانی ہو کر مسکرانے لگی۔ میری کو تھوڑا وقت اور انتظار میں گزارنا پڑا۔ سیڑھیوں پر پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ میری کا دل دھڑکنے لگا۔ منٹا

نے دروازہ کھول کر آنے والے کو جھیلا۔

"صبح بخیر!" کہتے ہوئے آنے والے نے اپنا تعارف خود ہی کروایا اور منٹا اور میری کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"میں ٹامکھن ہوں۔ آپ منٹا ہیں نا؟"

پھر میری سے مخاطب ہوا۔

"آپ نے مجھے بلوایا ہے؟"

میری: "ہاں بیٹھئے۔ آپ نے ہمیں خوب پہچانا۔ منٹا تم نے بھی تو انہیں پہچان لیا ہوگا؟"

منٹا: "نام سے پہچانا ہے۔ اب تو آپ بڑے ہو گئے ہیں۔ شکل بھی بدل گئی ہے۔"

یہ سن کر وہ کھسیانے پن سے مسکرانے لگا۔ اور بولا۔

"تم بھی اب وہ چھوٹی بچی نہیں ہو۔ جو ان کے ساتھ ہمارے اسکول آیا کرتی تھیں۔ مگر میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا ہے۔"

میری نے دونوں کو بٹھایا۔ پھر کہا

"بہت دیر میں ملنے سے اکثر پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔"

منٹا نے اس سے کہا۔

"آپ کو یاد ہے جب ہم دونوں کھیلا کرتے تھے۔"
اس نے جوش سے کہا۔
"ہاں یاد کیوں نہیں؟"
منشا" تمہارا کھلونا گھوڑا بہت اچھا تھا بہت پیارا۔"
اس نے سوچتے ہوئے کہا۔
"تھا تو لکڑی کا۔ ہاں خوبصورت بنا ہوا تھا۔"
منشا۔" لکڑی کا کہاں تھا؟"
کسی قدر گھبراہٹ سے اس نے جواب دیا
"شاید چینی کا تھا؟"
منشا۔ "چمڑے کا نہیں تھا۔"
منشا کا منہ تکتے ہوئے بولا۔
"مگر اس کی ٹانگیں تو لکڑی کی تھیں۔"
منشا۔ سارے کا سارا چمڑے کا تھا۔ کمیت معلوم ہوتا تھا۔ یاد آیا؟"
سر کھجاتے ہوئے اس نے جواب دیا
"یاد آگیا۔ میں نے کہا تھا اس گھوڑے کو میں کبھی نہیں بھولونگا"
منشا"۔ تم دوسرے ملکوں کی باتوں میں بہت دلچسپی لیا کرتے تھے۔"
میری"۔ خصوصاً ہندوستان کی باتوں میں۔"

کچھ سوچ کر وہ بولا۔

"میں وہاں کی بہت سی چیزوں کو پسند کرتا ہوں"

منشا نے معنی خیز نظروں سے میری کی طرف دیکھا۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ وہ بھانپ گیا اور بولا۔

"آپ نے مجھے کون سی باتوں کے لئے بلوایا تھا؟"

میری۔ تمہیں دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ تمہیں دیکھے ایک عرصہ ہو گیا تھا"

یہ سن کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہا۔

"ہونہہ! صرف ملنے کی خاطر میرا حرج کیا۔ خیر۔ کچھ بات نہیں"

رسمی سلام دعا کے بعد وہ چلا گیا۔ منشا نے کھڑکی میں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ کر تسلی کر لی۔ پھر میری سے کہا۔

"خالہ۔ یہ ٹام نہیں تھا"

میری: کوئی بھی بات ایسی نہ تھی۔ جو ٹام کی باتوں سے ملتی ہوئی ہو۔

منشا: میں نے جان بوجھ کر ایسی باتیں کیں کہ وہ اور بھی پہچانا گیا"

میری: کیا ٹام کو میرا خط نہیں ملا ہوگا۔ اس کے ہاتھ پڑ گیا؟"

منشا: ایسا ہی معلوم ہوتا ہے"

میری: میں نے جو خط ٹام کو لکھا تھا اس نے وہ پڑھا ضرور ہے۔ اس سے

تمہارا نام بھی جان لیا۔"

منشا: "کیا آپ نے میرا نام لکھا تھا؟"

میری: "میں نے لکھا تھا۔ منشا بھی کل آئے گی۔"

منشا: "جب ہی اس نے آتے ہی پوچھا "آپ منشا ہیں نا۔"

میری: "میرا دل گواہی دے رہا ہے۔ ٹام بھی آج آئے گا۔"

منشا جی ہی جی میں دعا کرنے لگی "خدا کرے یہ مایوس نہ ہو۔"

تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ بجنے پر میری کی آنکھیں چمکنے لگیں

اور اس کے منہ سے نکلا۔

"یہ ......"

منشا نے اٹھکر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"خالہ کو آپ کے آنے کی امید تھی۔"

"صبح بخیر" کہتا ہوا ٹام اندر آگیا۔ اسے دیکھتے ہی پہلی بات

میری کے منہ سے یہ نکلی۔

"اس وردی میں تم کیسے بھلے لگتے ہو ٹام؟ اوہ میں بے تکلفی

برت گئی۔"

یہ کہکر اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا ہرج ہے۔ تکلف میں کیا رکھا ہے؟"

کہتا ہوا ٹام بیٹھ گیا۔ پھر منٹا بھی بیٹھ گئی۔

ٹام نے منٹا سے پوچھا۔

"واقعی یہ وردی مجھے پھبتی ہے؟"

منٹا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اس ٹام کھمن کی نسبت بہت بھلی لگتی ہے۔ جسے دو گھڑی پہلے آپ نے ہمارے امتحان کے لئے بھیجا تھا"

یہ سن کر ٹام کھِل کھلا کر ہنسا اور کہا۔

"میرا دوست ڈاسن آیا ہوگا۔ وہی ایسی شرارت کرسکتا ہے آپ دونوں جان گئی تھیں۔ وہ کوئی اور ہے؟"

منٹا: "بے شک اور اس سے باتیں کرکے تو پکّا یقین ہوگیا تھا"

میری: "کوئی تمہارا روپ بھرے تو میں دھوکا نہیں کھا سکتی ٹام۔ اس وقت تمہارا وردی پہنے اس طرح آنا مجھے جنگ عظیم کی یاد دلا گیا"

ٹام۔ یہ بھی تو جنگ عظیم کا ہی زمانہ ہے۔

میری۔ میں پہلی جنگ عظیم کو یاد کر رہی ہوں۔ وہ بھی کیا انقلابی دور تھا میں بھولنے کی کوشش کرتے ہوئے بھول نہیں سکتی میری اپنی زندگی میں بھی تبدیلی ہوئی تھی۔ میں بھی دوسری لڑکیوں کی طرح پھول بیچ کر چندہ اکٹھا کیا کرتی تھی۔ میں تمہیں بہت سی باتیں سنانا چاہتی

ہوں۔ سنو گے شام!"

شام:۔ "میں شوق سے سن رہا ہوں۔"

میری:۔ "ایک دن میں اپنی گھر کی کیاری کے اپنے پسندیدہ پھول بیچنے کو لے گئی۔ میں پھول بیچ رہی تھی۔ ایک تمہاری شکل کا خوبصورت جوان۔ اسی طرح وردی پہنے ہتھیار لگائے میرے قریب آیا۔ میں نے اسے اپنی قوم کا فرد جانا اور پھول پیش کر دیا۔ پھول لے کر اس نے سونگھا اور کہا۔

"اس میں خوشبو نہیں ہے۔ ہمارے وطن کے پھول بہت اچھی خوش بُو کے ہوتے ہیں۔"

میں نے حیرانی سے اس کا منہ تکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ یہاں کے باشندے نہیں؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ہندوستانی ہوں۔ مگر جس مقصد کے لئے آپ نے مجھے پھول دیا ہے۔ اس کا احترام کرنا جانتا ہوں۔"

یہ کہکر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک ساورن نکال کر میرے ہاتھ پر رکھدیا۔ یہ آج کا پہلا بڑا چندہ تھا۔ اس سے پہلے میں ہندیوں کو اچھا نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے میرا خیال بدل دیا

میرا دل اس سے باتیں کرنے کو چاہتا تھا۔ مگر صرف موسم سے متعلق ہی دو چار باتیں ہوئیں۔ اور وہ چلا گیا۔ یہ ایک معمولی ملاقات تھی۔ مگر مجھے یاد رہ گئی۔ میں نے اپنی ماں سے یہ ذکر نہیں کیا۔ انہیں ہندیوں سے چڑھ تھی۔ شاید ان کا کوئی عزیز کسی ہندی سے تکلیف پا چکا تھا۔ میں کیسے جاؤں ٹام!"

ٹام "ضرور کہیئے۔ کیوں منٹا؟"

منٹا "میں بھی یہ باتیں آج ہی سن رہی ہوں۔ اس لئے ضرور سننا چاہوں گی۔"

میری "کچھ لڑکیوں نے اپنے نام اسپتال میں خدمت کے لئے دے رکھے تھے۔ ان میں ایک میں بھی تھی۔ ہمیں بلجیم کی طرف بھیجا گیا کچھ دنوں کے بعد مجھے ساتھی لڑکیوں سے بچھڑ کر دوسرے خیمے میں جانا پڑا۔ وہاں جا کر میں نے اور بھی محنت سے کام کرنا شروع کیا مریضوں کا دل بہلانے کو ہمیں ہلکے ہلکے کھیل بھی کھیلنے ہوتے تھے۔ ایک دن تاش کھیلتے میں ایک زخمی کی آواز مجھے ایسی معلوم ہوئی جیسے پہلے کبھی سنی ہو۔ یاد نہیں آرہا تھا۔ کب اور کہاں سنی تھی۔"

منٹا "وہی ہندی تو نہ تھا؟"

میری: وہی تھا۔ مگر میں نے اسے پہچانا نہیں۔ فرض کے تحت اس کی بھی خدمت کرتی رہی۔ میں نے اسے اس وقت پہچانا جب وہ بالکل تندرست ہو گیا اور ایک دن وردی پہنے مسکراتا ہوا میرے قریب آکر میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔

اس کے بعد کبھی فرصت ہوتی تو وہ مجھ سے ملنے آجاتا۔ ہم دونوں میں خوشگوار باتیں ہوا کرتیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ ادھر مجھے اور ادھر اُسے ایک دوسرے کا خیال رہنے لگا۔ کئی دنوں کے بعد اس نے مجھ سے شادی کے بارے میں کہا میں نے ماں سے بہت سے قصّے سنے تھے۔ اس لئے یہ جواب دیا:

"جی۔ شادی! گویا آپ ابھی تک کنوارے ہیں"

کہنے کو میں نے کہہ تو دیا۔ مگر میرا جی یہی چاہتا تھا کہ وہ کنوارا ہو۔ اس نے کہا۔

"باپ نے مجھے باندھ کر بھیجنا چاہا تھا۔ مگر بچ ہی نکلا۔ اعتبار نہ ہو تو میری ڈاک پر قبضہ جمالو"

میں نے کہا۔ "آپ اپنے گھر لکھ بھی سکتے ہیں۔ بیوی کا ذکر میرے خطوں میں نہ آیا کرے"

وہ ہلسنے لگا اور اپنی جیب میں سے خطوط کا پلندہ نکال کر میرے آگے رکھتے ہوئے بولا۔

" آج سے پہلے مجھے آپ کی بدگمانی کا علم نہ تھا۔ یہ کافی عرصے کی ڈاک آپ کی تسلی کر سکتی ہے۔ ان میں کئی خط ہماری پہلی سرسری ملاقات سے بھی پہلے کے ہیں۔"

وہ خطوں کی تاریخیں مجھے دکھاتا اور خط کھول کر میرے آگے ڈالتا گیا۔ میں نہیں نہیں بھی کہتی گئی اور خط دیکھتی بھی گئی۔ اکثر خطوں میں زمینداری کے حسابات تھے۔ زمینداری کا پڑھکر مجھے لالچ بھی آیا۔ اس نے پوچھا۔

"کہیں بیوی کا ذکر ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ آپ کنوارے ہی ہیں۔ مگر میرا اپنی ماں سے صلاح لینا ضروری ہے۔ انہیں خط لکھدوں گی۔ جو جواب ملا۔ آپ کو دکھا دوں گی۔"

پھر میں نے ماں کو سب کچا چٹھا لکھ بھیجا۔ وہاں سے یہ جواب آیا ۔۔۔

" افسوس جس کام کو میں بُرا سمجھتی رہی جس سے ہمیشہ خائف رہی۔ وہی ہوا چاہتا ہے خیر تم جانو۔ ہاں میں یہ بتلائے بغیر نہیں

رہ سکتی کہ اپنی مرضی کی ان شادیوں میں جو والدین کی خوشی کے خلاف کی جائیں۔ جہیز سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔"

یہ خط میں نے ان کے آگے رکھ دیا۔ خط پڑھکر وہ کہہ اٹھے۔

"آپ کو بھی کیا جہیز کا لالچ ہوگا"

میں نے کہا "ہاں خائف بھی تو ہے"

وہ بولے "آپ تو خائف نہیں ہیں نا؟"

میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"اب بے خوف ہوں"

"وہ یہ غنیمت ہے۔ غالباً ان کی بدگمانی کسی تلخ تجربہ کی بنا پر ہے آپ مجھے بہت دنوں سے جانتی ہیں۔ خدا نے چاہا میرا شیوہ ہمیشہ سچائی ہوگا۔"

اس نے ہر طرح میری تسلی کردی۔ بہت کچھ عہد و پیمان کئے آخر ایسا ایک دن آگیا۔ جب ہماری شادی ہوگئی۔"

ٹام "پھر نباہ کیسا ہوا؟"

میری "وہ زندہ رہتا تو ضرور اچھا نباہتا۔"

ٹام "کیا وہ لڑائی میں کام آگیا؟"

میری کا گلا بھر آیا تھا۔ وہ بول نہ سکی۔ ٹام اس کا منہ تکتا رہا
پھر منٹا سے مخاطب ہو کر اس نے کہا۔

"انہیں شوہر کی موت کا تکلیف دہ منظر یاد آ گیا ہے۔ جب
کسی جہاز کو تارپیڈو لگے تو عورتوں اور بچوں کو بچانے کی کوشش
سب سے پہلے کی جاتی ہے۔ اس وقت عورتوں کے دلوں میں جو
طوفان اُٹھتے ہیں۔ وہ سمندر کے جوش کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے
ہیں۔ بچوں کی ماؤں کی بے چینی حد سے بڑھی ہوتی ہے۔ کبھی وہ
بچوں کا منہ تکتی ہیں۔ کبھی ڈوبتے ہوئے جہاز کو نظریں پھاڑ
کر دیکھتے ہوئے شوہروں کی جھلکی دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔"
میری ہوشیار ہو گئی اور بولی۔

"میری گود میں بھی بچہ تھا۔ مگر میں نے اس کے باپ کو ڈوبتے
ہوئے نہیں دیکھا۔ لڑائی ختم کے قریب تھی۔ وہ چھٹی پہ یہیں تھا
وطن سے ایک چٹھی آئی جس میں اس کی ماں کی بیماری اور بیٹے
سے ملنے کی خواہش لکھی ہوئی تھی۔ وہ سوار ہو گیا۔ ابھی وہ رستے
ہی میں تھا کہ اس کے گھر سے ایک تار ملا۔ تار میں اس کی ماں کی موت
لکھی تھی۔"

منٹا۔ "آپ کو افسوس ہوا ہوگا خالہ۔ کہ وہ ماں سے مل نہ سکا۔"

نام :- "یہ تو قدرتی ہے"۔

میری :- "وطن پہنچکر اس نے مجھے کوئی خط نہ لکھا۔ پہنچنے کا ایک تار دیا تھا اور بس۔ میں نے کئی خط لکھے۔ ایک کا جواب نہ ملا۔ وہ جلدی واپس آنے کا کہہ گیا تھا۔ اس لئے اب بجائے خط کے میں اسی کا انتظار کرنے لگی ہیں نے سوچا۔ وہ اچانک پہنچکر مجھے حیران کرنا چاہتا ہے۔ میں ہر اس جہاز میں جو ہند سے ادھر کو آتا۔ شہباز کو اس میں سوار سمجھکر اس کے خیریت سے پہنچنے کی خواہش کرتی"۔

منشا :- "ان کا نام شہباز تھا"۔

میری :- "ہاں شہباز خاں تھا ان کا نام۔ ایک جہاز میں آگ لگنے کی خبر پڑھتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ دل میں خیال آیا وہ اسی جہاز میں نہ ہو۔ یہ وہم مجھے بری طرح ستانے لگا۔ مختلف اخباروں میں اس جہاز کی مفصل خبریں تلاش کرتی۔ پتہ چلا کہ اس جہاز میں سے عورتیں اور بچے ہی بچائے جا سکے ہیں۔ میں بے قرار ہو گئی۔ گھبراہٹ میں ایک تار اس کے گھر کر دیا جس کا جواب اس کے چچا گلباز خاں نے یہ دیا۔

"شہباز یہاں سے لندن کے لئے سوار ہو گیا تھا۔ وہ اسی جہاز میں تھا جسے آگ لگ گئی۔ سوائے صبر کے چارہ نہیں"۔

اس کیفیت کا اظہار مشکل ہے۔ جو مجھ پر گذری۔ چند روز میں پاگلوں کی طرح رہی۔ جب ذرا ہوش درست ہوئے۔ تو اپنی حالت پر غور کیا۔ میرا دل اب ہندوستان جانے کو نہ چاہتا تھا۔ ادھر بچے کا خیال تھا سب مجھے یاد آیا۔ میرا بچہ اپنے دادا کا پوتا مانا جا چکا ہے۔ جوان ہونے پر وراثت جا سنبھالے گا۔"

ٹام:۔ "آپ وہاں جا کر کیا کریں۔ وہ خود ساتھ ہوتا تو اور بات تھی اپنے ہاں کے طور طریقے وہ بتا سکتا۔"

میری:۔ "وہاں بیوہ اور سہاگن کا فرق بھی بہت ہے۔ مجھے میری ماں نے ایک ہندی بیوہ کی عکسی تصویر دکھائی تھی۔ جب بھی یاد کروں۔ رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ سارے بدن پر سلوٹیں پڑا ایک ہی کپڑا لپٹا ہوا گلے میں کوئی کپڑا نہیں۔ سر کے بال صفاچٹ۔ آنکھوں میں ڈراؤنی چمک۔ تصویر دکھا کر ماں نے بتایا۔ انہیں شام کے بعد کھانا پینا منع ہو جاتا ہے۔ مچھلی عمر بھر نہیں کھا سکتیں خوشی کے کاموں میں ان کا موجود ہونا منحوس سمجھا جاتا ہے۔ آخر میں نے نہ جانے کا فیصلہ کر کے گلیاز خاں کو لکھ بھیجا۔ مکان تبدیل کرنے کا بھی اسے لکھا۔ پھر مکان تبدیل کر لیا اور بچے کو پالنے لگی۔۔۔۔"

یہاں تک پہنچکر میری رُک گئی اور ٹام کا منہ تکنے لگی۔ منٹا نے پوچھا۔

"آپ نے مکان کس لئے تبدیل کیا؟"

میری: "اس لئے کہ بچے کے وارث اک بچہ مجھ سے چھین نہ لے جائیں نئے مکان کا پتہ میں نے نہیں لکھا تھا۔"

ٹام: "کیا آپ بچے کو پال سکیں؟"

میری ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"میں خود نہیں پال سکی۔ مگر وہ پل کر جوان ہو گیا ہے۔"

ٹام: "اب کہاں ہے آپ کا بچہ؟"

میری: "سچ کہہ دینے سے گھبراتی ہوں کس طرح کہوں۔ تم ہی میرے بچے ہو ٹام!"

منٹا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پھر اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"میں حیران تھی۔ خالہ نے بغیر تمہید کے اتنی لمبی بات کیوں چھیڑ دی۔ اب معلوم ہوا۔ مامتا کے جوش نے بولا دیا۔"

ٹام گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ میری نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک طرف ہٹ کر اس نے کہا۔

"یہ کہانی تھی جو مجھ پر اثر ڈالنے کو بنائی گئی۔ ڈمی شادی شدہ جوڑے کا بچہ!"

میری:۔"بیٹھ جاؤ ٹام۔ تمہیں ڈمی بنانے کی مجرم میں ضرور ہوں۔ مگر بے بس تھی مجبور۔"

ٹام پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"کون ایسی ماں ہو سکتی ہے۔ جو اپنے نجیب بچے کو ڈمی بنا دے۔ آپ کو میری ماں کہلا کر کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟"

میری:۔"مجھے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا ٹام میں نے دنیا میں فائدہ اٹھانا سیکھا ہی نہیں۔ میں نے تمہیں پالنے کے لئے اور شادی بھی کر لینی چاہی۔ سب طے ہونے کے بعد مجھے جواب دینا پڑا اس نے ایک دن ایسی گفتگو کی جس سے ظاہر ہوا کہ وہ میرے بچے کو مفت کا اپنے اوپر بار جانتا ہے۔ اس نے تمہاری وراثت سے بھی یاس دلائی۔ مجھے بتایا کہ" جو اولاد باپ کے سامنے مرجائے اس کے بچے دادا یا نانا کے وارث نہیں ہو سکتے۔"

ایک دفعہ پھر دنیا میرے لئے اندھیر ہو گئی۔ وراثت کی محرومی کے صدمے سے میں بیمار ہو گئی۔ یہاں تک کہ زندگی سے ناامید ہو گئی جس وقت ہوش آتا بچے کا سوچتی۔ میں نے دعا کی۔ کہ

چند گھنٹوں ہی کے لئے مجھے صحت ہو جائے تو بچے کا کچھ انتظام کر لوں۔ یہ دعا سنی گئی۔ میں نے مارتھا اسی مالکہ مکان کو ساتھ لیا اور تمہیں پلنے کو چھوڑ آئی۔ دو سال تک میں بستر ہی میں رہی۔ پھر جیسے جیسے صدمہ بھولتی گئی۔ صحت ہوتی گئی۔"

ٹام کی شکل اس وقت ایسی تھی۔ گویا وہ ابھی دانت پیسنے لگے گا۔ منٹا نے نرمی پیدا کرنے کو کہا۔

"خالہ ان کا نام آپ نے کیا رکھا تھا؟"

"میری شہباز خاں ہی نے ان کا نام ٹام خاں رکھا تھا۔ میرا پہلا نام میری ٹامسن تھا۔ انہوں نے دونوں ناموں کی ملاوٹ سے یہ نام رکھا تھا۔ ٹام اور خان۔"

پھر وہ ٹام سے مخاطب ہو کر بولی

"تم نے اپنے دائیں بازو پر جلا کی رنگت سے ملتا ہوا نشان دیکھا ہوگا۔ وہ K (کے) ہے۔"

ٹام نے اپنا بازو کھولتے ہوئے کہا۔

"یہ داغ میں نے بارہا دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی۔ کیا خبر تھی۔ یہ میری زندگی کا تکلیف دہ نشان ہے۔"

نشان دیکھتے ہوئے وہ بولا۔
"میں اسے زخم کا نشان سمجھتا رہا۔ یہ مجھے کیا فائدہ دے سکتا ہے۔" "لعینی خان۔ ہونہہ!"
اس نے بازو ڈھک لیا۔ میری بولی
"روح کو تسلی ہو سکتی ہے۔ یہ فائدہ کم نہیں!"
ٹام:- میری روح کو تسلی ہے۔ میرے دل میں سوسائٹی کے بندھنوں کی کچھ وقعت نہیں۔ میری زندگی جو بنتی تھی وہ بن چکی جس باپ کو زبردستی آپ میرے سر منڈھنا چاہتی ہیں وہ زندہ بھی تو نہیں۔ اگر آپ کی شہرت گوارا کرے تو میں آپ کو ماں کہہ سکتا ہوں۔ مدد لینا چاہیں تو خوشی سے دوں گا۔"
میری۔ مجھے مدد نہیں چاہئے ٹام۔ میں خیال کرتی تھی۔ تم میری باتیں سن کر خوش ہو گے۔"
ٹام:- میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ سماج کے بندھن مذہب کی آڑ میں میرے لئے بے معنی ہیں۔
میری:- تمہارے باپ کی کچھ نشانیاں میرے پاس ہیں۔ وہ لوگے؟"
ٹام:- مجھے خواہش ہے نہ ضرورت۔ ہاں اگر ان کے دینے سے

آپ کے دل پر سے کچھ بوجھ اترنے کا خیال ہو تو دیدیجئے۔
میری نے منٹا کو اشارے سے اندر کے کمرے میں ایک چھوٹا چرمی بکس دکھاتے ہوئے کہا۔
"وہ بکس لے آؤ منٹا"
ٹام اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔
"میں لے آتا ہوں"
بکس لاکر رکھتے ہوئے ٹام نے کہا
"دیکھیں کیا نشانیاں ہیں؟"
میری بکس کھول رہی تھی' اور ٹام کے ساتھ منٹا بھی مشتاق نگاہوں سے تک رہی تھی۔ میری نے اپنے نکاح کی تاریخ وغیرہ کا نوٹ جو رجسٹر کے مطابق تھا نکال کر ٹام کو دیا۔ پھر اس کی پیدائش کی پرچی اور اس کے متعلق شہباز کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یادداشت اسے دی اور اس کے دادا کا وہ خط جس میں دادا نے ٹام کو پوتا مانا ہوا تھا اس کے حوالے کیا۔ پھر اپنی شادی کی انگوٹھی اور ایک سونے کا قلم جس پر شہباز کا نام کندہ تھا۔ ٹام کو دیا۔ قلم ہاتھ میں لے کر وہ بولا
"مرے ہوئے آدمی سے کوئی کس طرح محبت کرے!"

ٹام نے ہر ایک چیز کو غور سے دیکھ دیکھ کر ایک طرف رکھ دیا تھا وہ پھر بولا۔

" یہ چیزیں اب کس کام آسکتی ہیں ؟"

منتا۔" میں سمجھتی ہوں۔ ان چیزوں سے تمہاری کایا پلٹ ہو سکتی ہے۔"

ٹام :" کایا پلٹ ! یعنی میرا چہرا کالا ہو سکتا ہے۔ قد چھوٹا اور نقشہ باریک ہو کر میں چھ فٹے مرد سے ایک سانولی سلونی۔ کامنی سی عورت بن سکتا ہوں۔"

منتا :" تم تو میری بات کا مذاق اڑانے لگے۔"

ٹام :" ایمان کی کہو منتا میں اپنی رگوں میں ہندی خون محسوس کر کے کیا فخر کر سکتا ہوں۔"

ٹام کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا

ہیرمی نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

" ڈومی ہونے سے تو ہندی خون بُرا نہیں ہوتا۔ تمہاری رگوں میں بہادر سپاہی کا خون ہے میری جان۔"

ٹام :" آہ ! یہ محبت میں گندھے ہوئے الفاظ میرے کھولتے ہوئے خون کو ٹھنڈا کر دیں گے۔ یہ میرے جوش کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں جیسا بھاپ کے منجمد قطروں کے ساتھ اونچائی کی ٹھنڈی

ہوا کیا کرتی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ اس کیفیت کو چھپانا چاہتا تھا۔ اس نے جیب میں سے رومال نکالا اور منہ پھیر کر سر جھکاتے ہوئے آنکھوں کی نمی کو رومال میں جذب کیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے سوال کیا۔

" وہ انگوٹھی جو آپ نے انہیں دی تھی کہاں ہے؟

منٹا۔ وہ ان کے پاس کہاں سے آتی!

کچھ وقت ٹام انگوٹھی کے ساتھ کھیلتا رہا۔ ہر ایک انگلی میں پہن پہن کر دیکھی۔ پھر منٹا سے کہا۔

" تم یہ انگوٹھی پہن کر دیکھو۔"

منٹا" نہ معاف کیجئے۔"

ٹام" میری کسی بھی انگلی میں پوری نہیں آتی۔ شاید تمہاری انگلی میں آجائے۔"

منٹا" میں تو نہیں پہنتی۔"

ٹام" کیوں مگر!"

میری" انگوٹھی کا کچھ مقصد بھی ہوا کرتا ہے۔ نا بیٹا!"

ٹام نے منٹا سے کہا" پہن کر دیکھو تو سہی۔ انگوٹھی پہنتے ہی

تم مسز خان بن جاؤ گی۔"

منٹا:" مجھے تو ہر ایک خان سے خوف آتا ہے۔"

ٹام:" ہندی خون کی وجہ سے نا؟"

منٹا:" نہیں نہیں۔ یہ بات نہیں۔ خوف کی خاص وجہ ہے۔"

ٹام:" ذرا ہم بھی سنیں۔"

منٹا:" ایک ہندی لڑکی سے میرا میل جول ہو گیا تھا۔ ایک دن باتوں میں میں نے اس سے پوچھا" آپ کے ہاں بچوں کو ڈرایا کیوں کرتے ہیں۔" وہ چمک کر بولی:" کیسے ڈرایا نہ جائے۔ بچوں کو کھلا چھوڑ دیں۔ تو انہیں خان پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ اور بھون کر کھا جاتے ہیں۔" اب کہئے۔ خان سے خوف کھانا چاہیئے یا نہیں"

یہ سن کر ٹام اتنا ہنسا کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ اور آنکھوں میں سے پانی بہہ نکلا۔ اسی طرح اس کی ساری کوفت دور ہو گئی۔ میری اور منٹا بھی ہنس رہی تھیں۔ پھر ٹام نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے خان بننا منظور ہے کیوں منٹا۔ تم مجھ سے شہر بھر کے بچوں کو ڈرایا کرو گی نا؟ مگر خود ڈرنا چھوڑ دو۔ تم اب بچہ نہیں ہو۔"

منتًا: "آج سے تمہیں خاں جی کہا کروں؟"

ٹام: "کیوں منتا یہ غیریت کس لئے!"

میری: "میرے لعل۔ منتا ہنسی کر رہی ہے۔"

ٹام: "خالہ آپ کو یہ چیزیں بوجھ معلوم ہوتی ہیں۔ منتا انہیں سنبھال کر رکھ لے۔ میں ساتھ ساتھ کہاں لئے پھروں گا۔"

منتا: "یہ اچھی رہی۔ تم خان بھی بن گئے اور میری خالہ ابھی تک آپ کی بھی خالہ ہی رہیں۔"

ٹام: "میرے خیالات دور پہنچ رہے ہیں۔ منتا مجھے بچپن کا زمانہ یاد آرہا ہے وہ تمہارے ساتھ میرا کھیلنا اور تمہارے خالہ کہنے پر میرا بھی انہیں خالہ کہنا۔ مجھے اب بھی خالہ ہی کہنے دو منتا۔ میری دلی آرزو ہے کہ یہ تمہارے سبب سے میری خالہ بن جائیں۔"

میری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ جوش گریہ سے اس نے ٹام کے آخری الفاظ نہیں سُنے۔ منتا کے جواب نے اسے ہوشیار کیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"میں بچپن کا زمانہ بھولی نہیں ہوں ٹام۔ میں تمہاری خواہش کا احترام کرتی ہوں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گی کہ آپ کے ماں نہ

کہنے سے ان کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔"

ٹام نے آنسو پونچھتی ہوئی ماں کو بازوؤں میں تھام کر کہا۔

"ماں۔ تم روتی کیوں ہو۔ تمہاری مصیبتیں کٹ گئی ہیں۔ اب تمہارے لئے خوشی ہی خوشی ہے۔

میری نے حسرت ناک لہجے میں منٹا سے پوچھا۔

"تم نے کونسی خواہش کا احترام کیا تھا منٹا؟"

منٹا لجا گئی۔ ٹام نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اور ماں کو محبت بھری نظروں سے تکتے ہوئے کہا۔

"ماں۔ میں نے کہا تھا میری خواہش ہے۔ آپ منٹا کے رشتہ کے سبب میری خالہ بھی ہوں۔ اس کا جواب منٹا نے دیا تھا۔"

میری۔ "تمہارا انتخاب بہت اعلیٰ ہے میرے بچے۔ منٹا اصیل لڑکی ہے۔"

یہ سن کر ٹام کو ڈاسن کی بات یاد آئی کہ بڑھیا لڑکی کی تعریف تمہارے پاس کریگی۔ وہ جی ہی جی میں خوب ہنسا۔ پھر منٹا کے آگے چیزیں سرکاتے ہوئے بولا۔

"لو یہ سنبھال لو منٹا۔ پھر مجھے بخوشی الوداع کہو۔"

منٹا نے اسی چمڑے کے بکس میں سب چیزیں بند کر کے ٹام کی طرف پُرحسرت نظروں سے تکتے ہوئے کہا۔

"کیسے الوداع کہوں ٹام! دل نہیں مانتا۔

ٹام:- میرا دل بھی نہیں مانتا۔ مگر مجھے فرض پکار رہا ہے منٹا"

منٹا:- فرض! ہاں جاؤ ٹام الوداع۔ عنقریب مجھے بھی فرض پکاریگا۔

میری۔ منٹا! مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔ میرا سہارا بنی رہو!"

منٹا:- خالہ۔ کیا آپ فرض سے الگ رہیں گی؟"

میری:- اچھا۔ شکر ہے۔ میں ابھی فرض کی پکار سننے کے قابل ہوں"

ٹام اُٹھ کھڑا ہوا۔ میری اور منٹا اسے نیچے تک چھوڑنے گئیں۔ مارتھا ٹام کو دیکھکر بہت خوش ہوئی۔ ٹام خدا حافظ۔ خدا حافظ کہتا ہوا چلا گیا۔

لبیا میں ہسپتال کے ایک حصے میں تیزی تن دہی سے زخمیوں کی تیمارداری میں مشغول ہے اور دوسری طرف ایرا منٹا جان توڑ محنت سے کام کر رہی ہے۔ لبیا ہی میں ٹام بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھا رہا ہے۔ فرصت کے اوقات میں کبھی ان تینوں کو آپس میں ملنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اور کبھی کوئی دو مل بیٹھتے ہیں۔ ٹام کو فرصت کم ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ کسی وقت ادھر آ نکلتا ہے اور کبھی ماں سے اور کبھی منٹا سے مل جاتا ہے۔ ٹام اور منٹا میں پٹھان کا مذاق اب بھی چلتا ہے۔ ایک دن ٹام نے منٹا سے کہا۔

"تم دبلی ہوتی جا رہی ہو منٹا"

منٹا "غذا تو میں تم سے بھی زیادہ ہی کھاتی ہوں گی"

ٹام "تم غذا کھاتی ہو اور تمہیں خوف کھا رہا ہے"

منٹا "خوف کیسا

وہ سمجھ نہ سکی۔ ٹام کس بات کی تمہید اٹھا رہا ہے۔ ٹام نے منٹا کی بات کا سنجیدگی سے جواب دیا۔

"خوف۔ یہی پٹھانوں کا"

منٹا کھلکھلا کر ہنسی ٹام بھی ہنس رہا تھا۔

پھر منتا نے کہا۔

"خوف ہے ضرور۔ وہ یہ کہ میرا پٹھان کہیں دوسرے پٹھانوں کی بھجیا پکا کر نہ کھا جائے۔ زخمی بھی پڑے ہیں۔ ان میں بہتیرے پٹھان ہیں۔"

ٹام: "تمہارا خان مری مکھی کی ٹانگ توڑنے والے بہادروں میں سے ہے؟"

منتا: "اب اپنی بہادری کے گیت میرے منہ سے سننا چاہتے ہوگے۔"

ٹام: "ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی ہے منتا۔" یہ کہہ کر وہ سامنے کی طرف نظریں جما کر تکنے لگا۔ وہ اس طرح تکتے ہوئے خاموش تھا۔ آخر منتا نے اسے ٹوکا۔

"کیا دیکھ رہے ہو ٹام؟"

وہ چونک کر بولا۔

"ایک آدمی تھا۔ میری طرف گھور گھور کر دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔"

منتا ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"کوئی خان تھا؟"

ٹام: "نہیں منتا۔ مذاق نہیں۔ کچھ دنوں سے یہ شخص میری نگرانی کر رہا ہے۔ جاسوس ہے شائد۔"

منشا:۔ مگر جاسوس اس طرح گھورا کرتے ہیں۔ انہیں خیال نہیں ہوتا کہ پکڑے جائیں گے۔"

ٹام:۔ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ ممکن ہے کسی دن وار کر دے۔"

منشا۔ پھر تم ہی اس کا حلیہ نہ نکلوا دو۔ اسے ارادے میں کامیاب کیوں ہونے دو۔

ٹام:۔ یہ تو بزدلی ہے۔"

منشا:۔ کیا بزدلی ہے۔ قیمتی جان خطرے میں رہنے دینا قوم کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔"

ٹام۔ مجھے خدا پر بھروسہ ہے منشا۔ وہ سامنے سے گذرا تو مجھے خیال ہوا۔ ورنہ میں ایسوں کو کیا گنتا ہوں۔ اچھا۔ میں اب چلتا ہوں ماں کو میرا سلام دینا۔"

ٹام چلا گیا اور منشا جاسوس کا سوچتی رہ گئی۔

دوپہر کے وقت ٹام اپنے کمرے میں لبتر سے ٹیک لگائے۔ پاؤں پھیلائے۔ آنکھیں بند کئے آرام کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں کسی کے دبے پاؤں چلنے کی آواز کمرے کے اندر ہی سے آئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہی آدمی جسے یہ

جاسوس خیال کرتا تھا۔ اس کے قریب کھڑا اسے گھور کر تک رہا ہے
ٹام فوراً اٹھا۔ اور عجلت سے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے
پکڑ لئے اور کہا۔

"میں کتنے دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ تو میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اب
بتا۔ جاسوس!"

وہ لجاجت سے بولا۔

"میں جاسوس نہیں ہوں نوجوان"

ٹام نے ڈگ جمانے کو پاؤں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جاسوس نہیں تو میری نگرانی کیوں کر رہا ہے"

وہ بولا "دیکھیے۔ میں زخمی ہوں۔ زخم اور کھل جائے گا۔ پاؤں
کی نسبت آپ زبان سے اچھی گفتگو کر سکتے ہیں"

ٹام "تم زخمی ہو۔ جاسوسی کے لئے لنگڑے نہیں بنے ہوئے۔ اچھا
بتاؤ۔ میری نگرانی کس لئے کر رہے ہو؟"

اس نے کہا۔

"میں نگرانی نہیں کر رہا اور مجھ پر جاسوسی کا الزام دھرنا میری
وفاداری پر حرف لانا ہے۔ میں مہدی ہوں شہنشاہ کا باوفا
شہری"

ٹام کو اس کی باتیں بناوٹ سے پاک معلوم دیں۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلا۔ ٹام نے اس کا پیچھا کرتے ہوئے پکارا "ٹھہرو! جاتے کہاں ہو۔ پیشتر اس کے کہ میں تمہاری زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ ایک دفعہ اور پوچھتا ہوں۔ بتاؤ تم میری نگرانی کیوں کر رہے ہو؟"

وہ ٹام کی للکار سن کر ٹھہر گیا تھا حسرت بھری بے خوف نگاہوں سے تکتے ہوئے بولا۔

"میں کسی سے کم شہنشاہ کا وفادار نہیں ہوں۔ اعتبار کیجئے۔ میں آپ کی نگرانی نہیں کر رہا۔"

"نگرانی نہیں تو اور کیا ہے۔ میں اسے نگرانی ہی سمجھتا ہوں۔ اس لئے جب تک تم نگرانی کا سبب نہ بتاؤ میں تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔ اور خطرناک قسم کا جاسوس سمجھتے ہوئے خود ہی تمہیں ختم کر دوں گا۔"

اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

"میں آپ کے ہاتھ سے بھاگ نکلنے کا مجرم ہوں اس لئے آپ میری کسی بات کا اعتبار نہیں کر رہے۔"

ٹام! کیا تم مجھے گھور کر نہیں دیکھتے رہے۔ کیا ابھی تم میرے نزدیک کھڑے ہو کر مجھے گھور نہیں رہے تھے۔ اس کا سبب تمہیں بتانا پڑے گا۔"

اس نے نہایت عاجزانہ لہجے میں کہا

"سبب میں بتا نہیں سکتا . . . ."

یہ سن کر ٹام نے پستول تان لیا اور اس کی لبلبی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک بار بولنے کی اور مہلت دیتا ہوں۔"

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کے ہونٹ گویا سل گئے تھے۔ وہ ٹام کا منہ تکتا رہ گیا۔ قریب تھا کہ ریوالور چل جاتا۔ ناگاہ ٹام نے للکار سنی۔

"روکو ہاتھ ٹام!"

یہ منٹا کی آواز تھی۔ ٹام کا ہاتھ خود بخود نیچے ہو گیا۔ کبھی وہ منٹا کی طرف دیکھتا۔ جو بھاگم بھاگ چلی آ رہی تھی اور کبھی اپنے شکار کی طرف۔ اب منٹا قریب پہنچ چکی تھی۔ سانس درست کرتے ہوئے وہ بولی۔

"یہ تو میرا مریض ہے ٹام۔ کمال کیا تم نے بھی۔ مریض پر ہاتھ اٹھایا!"

ٹام:" یہ تمہارے اسپتال کا زخمی ہے۔ میں نے جانا جاسوس ہے۔"

منٹا:" تم نے اسے جاسوس سمجھا۔ کیوں مگر؟"

ٹام:" یہ وہی تو ہے جس کا میں نے اس دن ذکر کیا تھا۔ آج میرے سر پر ہی آپہنچا اور بتاتا ہی نہیں۔ کیوں آیا تھا؟"

منٹا:" خون کی کمی کے سبب بعض زخمی عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ نرمی سے پوچھتے۔ تو شاید بتا سکتا۔"

منٹا نے دونوں کو ساتھ لیا اور ٹام کی آرام گاہ میں پہنچی۔ دونوں کو بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئی۔ پھر مریض سے مخاطب ہو کر بولی۔

" آپ نے اپنے ادھر آنے کا سبب کیوں نہیں بتا دیا؟"

مریض:" میرے پاس ایسی وجہ نہ تھی۔ جو معقول سمجھی جا سکے۔"

یہ کہہ کر وہ آوارہ نظروں سے ایک طرف دیکھنے لگا۔ ٹام نے منٹا سے کہا۔

" سن لیا ان کا جواب؟"

منٹا:" پوچھ تو لینے دو۔"

پھر وہ مریض سے مخاطب ہوئی۔

" معقول سمجھی جائے یا نامعقول۔ کوئی وجہ تو ہو گی۔ جو آپ اپنا بستر چھوڑ کر ان کی طرف بھاگے چلے آتے تھے۔"

مریض :۔"میں صرف انہیں دیکھنے آتا تھا اور بس"

منٹا :۔"آپ انہیں کیوں دیکھنے آتے تھے؟"

مریض :۔"مجھے ان پر پیار آتا ہے۔"

یہ سن کر دونوں مسکرانے لگے۔ پھر ٹام نے کہا۔

"پیار چھپ کر کیا جاتا ہے۔ آپ ان کے ذریعے مجھ سے ملاقات کر سکتے تھے۔"

منٹا :۔"چھپ چھپ کر آنا اور دیکھنا شبہ پیدا کرے ہی گا۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کو ان پر کیوں پیار آتا ہے؟"

مریض :۔"میرا دل ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ اُف! تھک گیا"

منٹا نے ٹام کی مدد سے بستر کھول کر لگا دیا اور مریض کو اس پر لٹا کر ٹام سے اس کے لئے دودھ پوچھا۔ ٹام نے ڈبے کا دودھ تیار کر کے منٹا کو دیا۔ اس نے مریض کو پلا دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہوشیار ہو گیا اور بولا۔

"میں انہیں جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔ آج دیکھنے کا اچھا موقعہ مل گیا"

منٹا اور ٹام ہنسنے لگے۔ پھر منٹا نے کہا۔

"مجھ سے ذکر ہی کر دیتے۔ میں اس سے بھی اچھا موقعہ مہیا کر دیتی"

مریض :۔ آپ بھی سبب پوچھتیں ۔ میں بتا نہ سکتا ۔ اب اجازت ہو۔ تو جاؤں ۔ مجھے کیا حق ہے ۔ آپ لوگوں کو اپنا وہم بتا کر پریشان کروں ۔"

ٹام :۔ بات صاف ہو جاتی تو کیا برا تھا۔"

منٹا :۔ بعض دفعہ وہموں کی کچھ اصلیت بھی ہوا کرتی ہے ۔ آپ کو کیا وہم ہے ؟"

ٹام :۔ آپ بتائیں تو سہی ۔"

مریض نے منٹا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ۔

" بتا دوں ؛ برا نہ مانیں گے ۔"

منٹا :۔ بے خطر کہو ۔ میں جو آپ کے پاس ہوں ۔"

مریض نے ٹام سے مخاطب ہو کر کہا ۔

" میرا نام شہباز خاں ہے ۔ میں نے اپنے بیٹے کا نام ٹام خاں رکھا تھا ۔ اس وقت میرا بچہ آپ کی عمر کا ہو سکتا ہے ۔ مجھے وہم ہے کہ وہ آپ ہیں ۔"

یہ سن کر دونوں ششدر رہ گئے ۔ منٹا کے منہ سے دبی دبی چیخ نکلی ۔ وہ پھر بولا

" میں اپنی بیوی میری کو پہچانتا ہوں ۔ وہی میری جسے آپ

ماں کہتے ہیں۔ ہاں۔ وہ مجھے دیکھے تو پہچانے نہیں۔ میں اس کے خیال میں مر چکا ہوں نا!"

ٹام نے منٹا کو اشارہ کیا کہ وہ مریض کو تسلی دے۔ منٹا نے مریض سے کہا "خاں صاحب۔ یہ میدان جنگ ہے۔ یہاں گھڑی میں کچھ ہے اور گھڑی میں کچھ ہے۔ ایسے وقت میں عزیز بچھڑ بھی جاتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ مدتوں کے بچھڑے ہوئے اتفاقاً مل جائیں۔ مجھے بے انتہا خوشی ہو گی۔ اگر آپ کے عزیز آپ سے مل سکیں"

ٹام "کل دوپہر ہم پھر اسی جگہ ملاقات کریں گے۔ ماں بھی آئے گی۔ کیوں منٹا؟"

منٹا "میں خالہ کو ضرور آنے کی دعوت دوں گی"

مریض کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اسے بے حد تسلی ہوئی تھی۔ پھر ٹام میدان کی طرف گیا۔ منٹا خان کو بہلاتی ہوئی اپنی طرف لے گئی۔

منٹا صبح کے کام سے جلدی جلدی فارغ ہوئی اور میری کی طرف گئی۔ اسے کام میں منہمک دیکھ الگ کھڑی رہی۔ میری کی نظر اس پر پڑی تو اس نے سوالیہ طرز سے منٹا کو دیکھا۔ منٹا نے

"صبح بخیر!" کہتے ہوئے کہا۔

"میں نے فرصت نکالی ہے۔ آپ سے ضروری ملنا تھا۔"

میری۔ "صبح بخیر! مجھ سے ضروری ملنا! خیریت ہے۔"

منٹا۔ "میں برآمدے میں آپ کی انتظار کروں گی۔ فارغ ہو آیئے۔"

میری پھر کام میں لگ گئی اور منٹا برآمدے میں بیٹھکر بننے کا کام کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں میری بھی آگئی۔ منٹا سوچنے لگی۔ "بات شروع کیوں کر کرے۔"

میری: ہاں۔ وہ ضروری ملنا کیا کہا تھا تم نے منٹا؟

منٹا: بات یہ ہے خالہ۔ کل میں نے اور ٹام نے خیال کیا۔ آپ کا رنڈاپا سہاگ سے بدلا جا سکتا ہے۔"

میری خوب ہنسی اور اس نے کہا۔

"بہت شریر ہو تم دونوں۔ مذاق بھی نرالے ہی گھڑتے ہو؟"

منٹا: مذاق نہیں خالہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ قدرت یہ چاہتی ہے۔ بھلا آپ تقدیر کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔"

میری نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "یہ سچ ہے منٹا میں تقدیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی! ہمیشہ میں قسمت کے ہاتھوں کھلونا بنی رہی۔ کئی دفعہ اپنی زندگی کسی کے ساتھ وابستہ کر دینا چاہی

مگر قسمت حائل ہوتی رہی۔ سب طے ہو چکتا۔ تاریخ کا تعین ہوتے وقت قصہ ختم۔ اب تو ایک عرصہ سے یہ خیال ہی چھوڑ رکھا ہے تم دونوں بھی اس بارے میں کچھ نہ سوچو۔ انجام وہی ہو گا جو ہو تا رہا ہے۔"

منشا: "کیا خبر آپ کے لئے خدا نے بڑھاپے کا آرام رکھا ہو؟"

میری: "عجیب ہستی ہے وہ۔ نرالے طریقے کا پیغام ہے۔ ساٹھ کی شادی بچے رچائیں۔"

منشا: "شادی کا پیغام نہیں خالہ۔ یہ بات ہی کچھ اور ہے۔"

میری: "کیا بات ہے؟"

منشا: "اگر شادی رچائے بغیر آپ کو سہاگ مل جائے تو؟"

میری: "کسی جانور کا نام سہاگ ہے؟ کوئی پھول سہاگ کہلاتا ہے! کسی پھل کو سہاگ کہتے ہیں!! کیا چیز ہے وہ؟"

منشا: "کیا آپ ناراض ہیں؟"

میری: "میں ناراض نہیں ہوں میری جان! بات سمجھ میں نہیں آرہی۔"

منشا: "ہم دونوں کو شبہ ہوا ہے کہ آپ کا خان زندہ ہے۔"

میری: "میرا خان! شہباز خاں زندہ ہے؟ نہیں منشا یہ ہو نہیں سکتا۔ وہ ایسا نہ تھا بے وفائی وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے کچھ برس اس کے ساتھ گزارے ہیں۔ اس نے کبھی بھی کسی کے ساتھ دھوکا

نہیں کیا تھا۔ وہ مفلس بھی ہوتا۔ تو بھی بیوی بچّے کی پرواکرتا۔ مگر
وہ تو بھاری ملک کا اکیلا وارث تھا۔ دیکھنا منٹا کہیں کسی کے دھوکے
میں نہ آجانا۔ آجکل جاسوس بھی چھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔"
منٹا نے خفیف سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"ٹام آپ ہی کا بیٹا ہے نا۔ اس نے بھی اسے جاسوس ہی جانا تھا!"

میری۔" پھر کیا کیا ٹام نے؟"

منٹا۔" میں وقت پر نہ پہنچ جاتی۔ تو وہ بے چارہ ٹام کے ہاتھوں ہو ہی چکا تھا۔"

میری۔" تم کیوں حائل ہوئیں؟"

منٹا۔" میں اپنے مریض کی موت کیسے گوارا کرسکتی تھی!"

میری۔" کون تھا تمہارا مریض؟"

منٹا۔" وہی شہباز خاں۔"

میری۔" کوئی شہباز خاں نامی آدمی اس جگہ موجود ہے۔ مگر تم نے اسے میرا خان کیسے جانا؟"

منٹا۔" اب تو ٹام بھی یہی سمجھتا ہے!"

میری۔" پوری بات بتاؤ۔ ٹام نے اسے جاسوس کیسے خیال کیا۔ پھر اس کی رائے کیونکر تبدیل ہوئی؟"

منٹا: کل دوپہر میں ٹام کی انتظار کر رہی تھی۔ اس نے آنے کا جو وقت دیا تھا۔ گزرا چلا جا رہا تھا۔ ایکا ایکی میرا جی گھبرانے لگا۔ ٹام وقت دے کر نہیں بھی آیا کرتا۔ مصروف آدمی ٹھہرا۔ میں نے اس کے نہ آنے کا کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا۔ مگر کل میں گھبرا کر خود اس کی طرف چل پڑی۔ دور ہی سے ٹام کو اپنے مریض پر پستول تانے دیکھکر میں بے چین ہو گئی۔ اور اسے پکار کر اس حرکت سے باز رکھا۔"

میری۔ تمہارے روکنے ہی سے اس نے اپنا خیال بدلا۔"

منٹا: "سنئے تو سہی۔ سب قصہ سن کر آپ کو بھی خیال بدلنا پڑے گا۔"

منٹا نے گذشتہ روز کا واقعہ میری کو من وعن سنایا۔ وہ غور سے سنتی رہی۔ جب سن چکی تو پوچھا۔

"کیا کہا تھا اس نے۔ میں اس کے یعنی میرے خیال میں مر چکا ہوں۔"

منٹا: "ہاں یہی کہا تھا۔"

میری: "ہاں یہ بھی کہا تھا نا کہ میں اسے پہچان گیا ہوں۔"

منٹا: "جی کہا تھا۔"

میری: "میں تمہارے ساتھ چل کر اسے دیکھوں تو سہی۔"

منٹا ” دوپہر ہی ملاقات کے لئے مقرر ہے۔ سب اکٹھے ہوں گے۔“

میری خاموش تھوڑی دیر کچھ سوچتی رہی۔ پھر کہا۔

” ایک نظر بھی نہ دیکھوں ؟“

منٹا ” دوپہر کونسی دور ہے ؟“

میری ” اچھا۔ دوپہر ہی سہی “

منٹا اپنی طرف گئی اور میری ادھر کام میں لگ گئی۔

دوپہر کے وقت منٹا تہماز کے ساتھ ٹام کے کمرے میں پہنچی۔ وہ ابھی باہر ہی تھا۔ کچھ وقت انہیں انتظار کرنا پڑی۔ دونوں خاموش تھے۔ تہماز امید و ناامیدی کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا وہ بڑبڑایا۔

” آج میری قسمت کے فیصلے کا دن ہے۔“

منٹا ” تھوڑی دیر میں آپ عزیز بیوی کے شوہر اور معزز جوان بیٹے کے باپ مانے جائیں گے۔“

تہماز ” اگر نہ مانا گیا تو کیا ہوگا ؟“

منٹا ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھی۔ سامنے سے ٹام آتا دکھائی دیا۔ قریب پہنچکر بولا ” دوپہر اچھی گذرے !“

پھر شہباز سے مخاطب ہو کر کہا۔" خاں صاحب۔ آج آپ کی صحت بہت اچھی ہے۔"

شہباز:۔ اگر یہ غیریت کا تخاطب دور ہو سکا۔ تو میری صحت اور بھی اچھی ہو جائے گی۔"

پھر اس نے منٹا سے کہا۔

" میں انہیں دیکھتا ہوں تو میرا چلیوں خون بڑھتا ہے۔ میں اپنے اسی خیال میں رہنا چاہتا ہوں۔ ان کا دیکھ لینا میرے لئے کافی ہے۔ اب میری سے نہ ملوں گا۔ مبادا وہ میری امیدوں کا خاتمہ کر دے۔"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے اٹھنے لگا اور بولا۔

" میں جاتا ہوں۔ کیوں صاحب کبھی آپ کو دیکھ جایا کروں۔ تو۔۔۔۔"

منٹا نے مسکرا کر کہا۔

" تو یہ آپ کو جاسوس نہیں سمجھینگے۔"

ٹام:۔ بیٹھئے، ابھی ماں آتی ہے۔ یقیناً وہ آپ کو پہچان لے گی۔

شہباز:۔ امید و بیم میرے لئے اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ میرے خیالوں کی دنیا اس کے ایک "نہ" کہنے سے برباد ہو کر رہ جائے۔ مجھے

جانے دو۔"

منشا:- یاس کا موقع آنے کی امید نہیں۔ اور اگر ایسا ہوا۔ جب بھی آپ
کو مایوس نہیں ہونے دیں گے۔"

ٹام:- آپ نے میری ماں کو پہچانا ہے نا؟

شہباز:- ہاں یقین کے ساتھ پہچانا ہے۔ اور میں اسی خیال میں رہنا چاہتا
ہوں اور جو میری کہدے تم وہ نہیں ہو۔ اُف پھر۔۔۔!"

سامنے سے میری چلی آرہی تھی۔ شہباز نے اسے دیکھا اور کہا۔

"لو وہ آگئیں۔ اب میں جانا چاہتے ہوئے بھی نہیں جا سکتا۔ میرے
پاؤں کسی طاقت نے پکڑ لئے ہیں۔ اے خدا!"

میری نے اندر آکر کہا۔

"دوپہر اچھی ہو!"

ٹام:- "دوپہر خوش گزرے!"

میری:- شاید مجھے کچھ دیر ہو گئی ہے؟"

شہباز کو دیکھکر میری کی آنکھیں جھک گئیں۔ وہ ایک طرف
ہٹ کر بیٹھ گئی۔ شہباز نے اس کی بات کا منہ ہی منہ میں جواب
دیا۔

"کاش تھوڑی اور دیر ہو جاتی۔ میں جا چکتا۔"

میری نے اس کے ہونٹوں کی بات کچھ پڑھی اور کچھ اندازہ لگایا۔
اور منٹا سے کہا۔

" یہی ہیں آپ کے مریض ؟ یہ میرے یہاں پہنچنے سے پہلے چلے
جانا چاہتے تھے ہے نا ؟"

منٹا :" ہاں یہی ہیں ۔ انہیں گھبراہٹ ہے کہ آپ انہیں پہچان سکیں
تو کیا ہوگا ۔ ابھی کہہ رہے تھے :" یاس کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا
اس حالت میں پھر بھی اچھا ہوں ۔"

میری :" گویا یہ اپنے خیال پر یقین نہیں رکھتے ۔

ٹام :" جو آپ انہیں اپنے شوہر کا بھوت کہدیں تو ۔"

منٹا :" بھوت کیسے کہیں گی ۔ بھوت آدمیوں میں رہ بھی سکتا ہے ؟ آیا
اور گیا ۔ یہ تو کئی دنوں سے میرے سپرد ہیں ۔"

ٹام :" نہیں منٹا یقین رکھو ۔ کوئی انہیں برائی سے یاد نہیں کر سکتا ۔"

میری :" منٹا ۔ تم نے کہا تھا ۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ مجھے پہچان گئے
ہیں ۔"

شہباز :" ہاں ہاں پہچانا ہے اس وقت بھی پہچانتا ہوں ۔ میری
آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے رہیں ۔ میں آپ کے بیٹے کو بھی
اپنی شبیہہ پاتا ہوں ۔"

ٹام مسکرانے لگا۔ میری بولی۔

"اگر آپ وہی ہیں جو کہہ رہے ہیں۔ تو آپ کی شکل وہ نہیں۔"

شہباز: "یہی فکر مجھے ستا رہی تھی کہ آپ مجھے پہچان نہ سکیں گی۔ میں آپ کے بھاؤ میں مر چکا ہوں نا!"

ٹام: "یہ آپ کے مرنے کا قصہ کیا تھا؟"

منٹا: "یہ بتایئے آپ گم کہاں تھے؟"

شہباز: "میں گم کہاں تھا۔ یہ آپ کی خالہ ہی نہ معلوم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں خط لکھ لکھ ہار گیا۔ خود تلاش کرتے تھک گیا ان کا پتہ ملنا تھا نہ ملا۔"

میری: "مجھے ایک خط بھی میرے شوہر کا نہیں ملا۔ بلکہ میں خط لکھ لکھ ہار ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ آپ کوئی اور ہیں۔"

شہباز: "میرا تصور نہ توڑیئے۔ بات سن کر فیصلہ دیجئے۔"

جب مجھے آپ کا کوئی خط نہ ملا۔ تو میں نے ڈاک کے وقتوں کا دھیان رکھا۔ اور خود وصول کرنے کی کوشش میں لگا۔ ڈاک میرے ہاتھ آنے لگی۔ ایک دن آپ کا خط میں نے پایا۔ مگر اس پر میرے یک جدی گلباز خاں کا پتہ درج تھا۔ میں حیران ہوا یہ کیا بات ہوئی۔ کھول کر دیکھا تو اس میں مکان تبدیل کر لینے کا

ذکر تھا۔ اور یہ کہ بچہ جوان ہوگا۔ تو آپ لوگوں کے پاس آجائیگا۔ مکان تبدیل کرکے آپ کہاں گئیں اس کا کہیں ذکر نہ تھا میں جس نوکر کو خط ڈالنے کو دیا کرتا تھا اسے میں نے بلاکر ڈانٹا اور پوچھا۔

"میرے دیئے ہوئے خط کہاں ڈالتا رہا؟"

اس نے بتایا کہ اپنے ہاتھ سے وہ کوئی بھی خط نہیں ڈال سکا آپ کے چچا مجھ سے لے لیا کرتے تھے۔ میں آپ کا خط ہاتھ میں لئے سیدھا ان کے پاس گیا اور خط دکھا کر پوچھا۔

"یہ کیا لکھا ہے؟"

خط دیکھکر وہ بولے۔

"میرے نام کا خط تم نے کیوں کھولا؟"

میں:۔ "اس لئے کہ میری بیوی کے خط مجھے مل نہیں رہے تھے۔"

چچا:۔ "بڑوں کے آگے بیوی کا ذکر لاتے شرم نہیں آتی۔"

میں:۔ "شرم ورم میں نہیں جانتا۔ بتلایئے یہ خط آپ کے نام کیوں ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟"

چچا:۔ "مجھ سے کیوں پوچھتے ہو اپنے باپ ہی سے نہ پوچھو۔"

میں:۔ "خط آپ کے نام آئے اور پوچھوں ان سے۔ آپ کی اپنی

شرارت ہے۔"

چچا ۔" میں شرارتیں کرتا پھرتا ہوں۔ اور تم نے تو بھول منسی کی ہوئی ہے۔"

میں ۔" شادی کی ہے اور ابّا جانتے ہیں۔"

چچا ۔" وہ جانتے ہوں گے۔ ہم تو نہیں مانتے۔"

میں ۔" آپ نہ مانیں۔ مگر ہم دونوں کے درمیان آپ کو حائل ہونے کی ضرورت نہیں۔"

چچا ۔" جو ہونا تھا ہو گیا۔ وہ تو تمہیں رو بھی چکی ہے۔"

میں ۔" رو چکی ہے! میں مر گیا ہوں؟"

چچا ۔" اس کے لئے مر ہی چکے ہو۔"

میری آواز بھرا گئی۔ میں نے چیخ کر کہا۔" مجھ زندہ تندرست ہٹے کٹے کو کس نے مار دیا؟"

چچا ۔" اس کا تار آیا تھا۔ ہم نے بھی جواب دیا۔ وہ اسی جہاز میں تھا جسے آگ لگی۔"

میں ۔" میرے ساتھ ظلم ہوا ہے صریح ظلم!"

چچا نے لاپروائی سے کہا۔

"تمہارے باپ کی مرضی سے ہوا۔ جو ہوا؟"

میں خط ہاتھ ہی میں لئے اپنے کمرہ میں آ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اور جی ہی جی میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ تھوڑی دیر میں ابّا آئے۔ اور میرے پاس پلنگ پر ہی بیٹھ گئے۔ شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرانے لگے۔ میرے آنسو بہہ نکلے۔ انہوں نے مجھے چمکار کر کہا۔

"گلباز نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

میں: "ابّا وہ تو آپ کا نام لیتے ہیں۔"

ابّا: "میں نے اسے یہ ظلم ڈھانے کو کہا تھا اس نے مجھ سے پوچھا "میری بیٹی کا کیا بنے گا؟" میں نے بے بسی کا اظہار کیا۔ تو وہ بولا: "آپ بے بس ہیں نا۔ یہ معاملہ اب میں اپنے ہاتھ میں لوں گا۔ آخر زمینداری کا بچاؤ کرنا ہی ہے۔" بیٹا یہ مجھے دھمکی تھی۔ کہ میں تمہاری سی کہوں۔ تو وہ ہمارا تہس نہس کر دیں گے۔ میں جانتا ہوں وہ تمہیں دوسری شادی پر آمادہ کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے یہ گل کھلا دیا۔"

ٹام: "کیا آپ کی منگنی گلباز کی لڑکی سے ٹھہر چکی تھی؟"

شہباز: "بچپن سے نام دھر اگیا تھا۔ رسم کچھ نہیں ہوئی تھی۔"

منشا: "خالہ۔ آپ نے تار اپنے خسر کے نام کیوں نہ کیا۔"

میری: "انہی کے نام کیا تھا۔ میں گلباز کو جانتی بھی تھی۔"

ٹام ے" جنہیں خط چھپانا اور بیگانہ خط کھولنا آتا ہے۔ تار کھول
لینا اور خود ہی جواب دینا ان کے لئے منع نہیں۔"

شہباز:- "میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ نہ
ہی ابا سوچ سکتے تھے۔ ابّا مجھے بہلانے کی کوشش کرتے۔
مگر مجھے تسلی کیسے ہو سکتی تھی۔"

پہلے تو جس وقت چچا سے میرا سامنا ہوتا میرے تن بدن
میں آگ لگ جاتی۔ پھر میں نے غصہ ضبط کرنا شروع کیا۔ کیونکہ
ابا کی یہی خواہش معلوم ہوتی تھی۔ وہ ظاہرا بگاڑ پسند نہیں
کرتے تھے۔ چچا جب بھی میری دلجوئی کرتے مجھے بہت دکھ
ہوتا۔ ایک دن وہ ایسی ہی دلجوئی کی باتیں کر رہے تھے۔
ابا نے انہیں ٹوکا اور کہا۔

"ان کا رنج سچا ہے بھائی۔ خود مجھے بچے کی یاد ہر وقت
ستاتی ہے۔"

چچا:- "خدا نے چاہا۔ بچہ جوان ہو کر آ ہی جائے گا۔ انہیں شکر کرنا
چاہئے کہ وہ اپنے آپ چلی گئی۔ یہ سفید ہتھنیاں ہم غریبوں
سے پلتی ہیں؟ ایک پھیرا وطن کا کریں تو وہ تین ہزار کے سر پانی
پڑے۔ ابھی دنیا کی اونچ نیچ سے بے خبر ہیں نا۔ جب سمجھ

آئے گی۔ مشکور ہوں گے۔"

میں خاموش رہا۔ وقفے سے وہ پھر بولے۔

"شہباز بیٹا۔ اب برنج بھولنے کی کوشش کرو۔"

میں نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔ میرے دماغ میں چچا کے یہ الفاظ گونج رہے تھے "ایک پھیرا کریں تو دو تین ہزار کے سر پانی پڑے۔"

اس کے بعد میں اُٹھتے بیٹھتے یہی سوچتا "کس طرح دو تین ہزار ہاتھ آئے اور میں بیوی بچے کی تلاش میں نکلوں۔"

میری اور اسی کا خیال کر کے ابا نے مجھے زمینداری کا حساب کتاب لینا دینا سمجھانا شروع کیا اور میں روپے کے خیال سے اس کام میں دلچسپی لینے لگا۔

ایک دن ابا نے مجھے دوسرے گاؤں وصولی کے لئے جانے کو کہا۔ میں خوشی سے تیار ہو گیا۔ میں نے گرم کپڑوں کے بکس اور کمبلوں کا بستر کمرے سے اٹھوایا۔ تو چچا نے ٹوکا۔ "اتنے سامان کا کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "کیا معلوم کتنے دن لگیں۔ پھر گاؤں میں عزت بنا کر رہنے ہی سے کام چلے گا۔"

گاؤں سے مجھے کچھ اوپر ڈھائی ہزار روپیہ وصول ہوا۔ چچا تو وہ لینے میرے پیچھے پہنچے۔ کام ختم ہو چکا تھا۔ مگر میں نے ان سے کہا۔ ابھی تھوڑا کام باقی ہے۔ میں چاہتا تھا۔ وہ لوٹ جائیں۔ مگر وہ رک گئے اور مجھے ساتھ لے کر ہی ٹلے میں نے اپنا سامان اور خود چچا کے ساتھ گھر کو روانہ ہوا۔ ہم دونوں کے گھوڑے کافی تیز رفتار تھے۔ پھر بھی ہم رات سے دس گیارہ بجے گھر پہنچے۔ ابا سو چکے تھے۔ چچا کی ہمت مجھ سے روپے مانگنے کی نہ ہوئی اور میں ان کے سو جانے پر گھر سے نکل کھڑا ہوا اور اسی اسٹیشن پر پہنچا جس پر اپنا سامان بھجوایا تھا۔ گاڑی آئی اور میں بمبئی کے لئے سوار ہو گیا۔ جب لندن پہنچا ہوں۔ تو پہلے اسی مکان پر گیا۔ جہاں سے میں وطن کو روانہ ہوا تھا۔ معلوم ہوا مکان کی مالکہ مکان ہی بیچ گئی۔ اب کس سے پوچھوں۔ وہ مکان دار کچھ بتا بھی سکتی۔ اپنی طرف سے جو ہو سکا کیا۔ مگر پتہ ملنا تھا نہ ملا۔ تین چار مہینے مٹی چھانی۔ ہار کر گھر کو واپس ہوا۔"

میری: "گرمیوں کے دن تھے؟"

شہباز: "گرمیاں ہی تھیں۔"

میری: "ہم ایسے موسم میں کسی گاؤں چلے جایا کرتے تھے۔"

ٹام نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ مگر اس کی نظریں شہباز کے چہرے پر جم رہی تھیں۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں گھر پہنچا ہوں۔ تو چچا نے مجھے دیکھتے ہی صلواتیں سنانی شروع کیں۔" چور، اٹھائی گیرا، جعلساز، ڈاکو" کوئی ایسا خطاب نہ تھا جو مجھے دینا چھوڑا ہو۔ میں گالیاں کھا کر ابا کے پاس گیا۔ وہ چشم پر آب مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ پھر اپنے پاس بٹھا کر کہا۔

"آفریں ہے تمہاری برخورداری پر۔"

یا تو انہوں نے آفریں اس لئے کہی کہ میں چچا کی گالیاں سن کر خاموش رہا اور یا لعنت کی بجائے طنزاً کہی۔ یہ میں سمجھ نہ سکا پھر ابا نے پوچھا۔

"بچے کی تلاش میں گئے تھے؟"

میں: "جی ہاں!"

ابا: "کچھ پتہ چلا"

میں: "نہیں!"

ابا نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا:۔

"بتا کر چلے جاتے۔ سوچا ہوگا۔ گلبا زر کا وٹ ڈالے گا میں خود سنبھال لیتا۔ تمہارا جانا اور اس کا کھل کھیلنا۔ علاقہ والوں کو باغی کیا جا رہا ہے۔ تمہیں کرستان مشہور کرنے میں اسے آسانی رہی۔ تم وہاں سے ناکام لوٹے ہو اور میری کی زندگی میں رشوق کی شادی بھی نہیں کرو گے۔ اگر اس کی لڑکی سے نکاح کروا لو۔ تو کوئی جھگڑا نہ رہے"

میں "میں ان کی لڑکی کو خوش نہ رکھ سکا تو اور مصیبتیں کھڑی کریں گے"

ابا "میری روحانی اذیت کا خیال کر کے تم اسے تکلیف نہیں دو گے؟"

میں خاموش رہا۔ جی میں دعا کر رہا تھا۔ یہ مصیبت ٹل ہی جائے" ابا بولے۔

"جاؤ آرام کرو۔ میری بات پر غور کرنا"

میں وہاں سے اُٹھ آیا۔ اور اللہ میاں کے آگے ناک گھسی۔ کہ اس مصیبت سے بچ جاؤں۔ دوسرے دن ابا کے کمرے میں چچا چلا رہے تھے اور میرا نام لے لے کر بے نقط سنا رہے تھے پھر بھرائی ہوئی آواز میں انہوں نے کہا۔

"میں اس کافر کو بیٹی دوں گا۔ اس سے اچھا ہے۔ جو

میں اسے زندہ دفن کر دوں۔"

یہ سن کر میں نے خدا کا شکر کیا کہ ابا کے سامنے مجھے انکار نہ کرنا پڑا۔ چچا بول بک باہر نکل گئے اور میں ابا کے پاس جا کر خاموش بیٹھ گیا۔ وہ ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہے۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے دُکھے دل کی دعا ہے۔ ہمارا وارث ٹام خاں ہی کو بننا نصیب ہو۔ خدا وہ دن لائے ہی گا۔ ٹام میری آنکھوں کا نور میرے سینے سے چمٹا ہو گا۔"

میری :- "پوتا ہر حالت میں وارث کہاں ہوتا ہے۔ مرے باپ کی اولاد ورثہ نہیں پا سکتی۔"

ٹام :- مگر یہ تو زندہ سلامت اپنے باپ کے پاس بیٹھے ان کی باتیں سن رہے تھے۔"

میری اپنے گالوں پر طمانچے مارتے ہوئی بولی۔

"بولا گئی ہیں۔"

شہباز :- زمینداروں میں ہر حالت میں پوتا وارث ہوتا ہے۔ ورنہ یک جدی مالک بنتے ہیں۔ نواسے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اچھا تو چچا نے اپنی لڑکی بیاہ دی اور اپنی شادی بھی رچانے لگے۔"

ٹام :- "وہ کیوں؟"

شہباز :- "وارث ہی کے خیال سے ان دنوں ابا کے ایما سے میں نے چچا کی خوشامد شروع کی۔ ان سے میٹھی باتیں کرتا۔"

منتا :- "کانٹا بھی تو نکل گیا تھا۔"

شہباز :- "ان کی بیٹی کی شادی سے میرا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میں اس کو بہن ماننے لگا۔ چھکڑے بھر بھر اناج اور دوسری چیزیں اس کے لئے لے جایا کرتا۔ بھائی بھائی کہتے اس کا منہ سوکھتا۔ اپنے باپ سے جب ملتی میری تعریفوں کے پل باندھتی۔ آخر چچا نے اپنی شادی کا خیال چھوڑ دیا۔"

ٹام :- "اگر اس کی بیوی زندہ تھی تو آپ کو دعائیں دیتی ہو گی۔"

شہباز سنی اَن سنی کر کے اپنی سی کہتا رہا۔

منتا نے ٹام سے آہستہ سے کہا۔

"آج بڈھا تھکا نہیں۔"

ٹام نے بھی آہستہ کہا۔

"من تازہ ہے نا!"

شہباز کہہ رہا تھا۔

"ابا اکثر پوتے کو یاد کیا کرتے تھے۔ وہ تصور ہی تصور میں اسے

ناپ ناپ کر پال رہے تھے۔ چچا شروع میں اس ذکر سے ناک بھوں چڑھاتے رہے۔ پھر گوارا کرنے لگے۔ ابا مجھ سے اخبار پڑھوا کر سنا کرتے۔ چند ماہ ہوئے میں انہیں اخبار سنا رہا تھا۔ کیپٹن ٹامکمن کی تعریف سنا کر میں رک گیا۔ میرے جی میں تھی اور ابا کی زبان پر۔ کہہ اٹھے۔

"یہ تو میرا پوتا معلوم ہوتا ہے۔ اپنی خاندانی روایات کا حامل ٹام خاں ہی ہے خان بگڑ کر کمن ہوا۔ اور ٹامکمن بن گیا۔ تم جاؤ پتہ لگاؤ اور میرے بڑھاپے کے سہارے کو لا کر میرے سینے سے لگا دو۔"

میں نے تیاری شروع کی۔ چچا بھی خوش تھے۔ خود ساتھ فوجی دفتر گئے۔ پہلے میں کیپٹن تھا۔ اب بھی چچا نے اسی عہدے پر کروایا پھر ابا اور چچا نے ہنسی خوشی مجھے سوار کروا دیا۔ ہمارا دستہ مصر پہنچا۔ معلوم ہوا ہماری فوجیں آگے بڑھ چکی ہیں۔ حبب اور مدداس طرف آنے لگی۔ تو میں کوشش کر کے ساتھ ہو گیا۔ آتے ہی زخمی ہوا۔ منٹا تیماردار تھی۔ ایک دن دور سے دیکھا۔ آپ منٹا سے کھڑی باتیں کر رہی ہیں۔ اسی طرح ٹام خاں کو دیکھا۔ اسی طرح آپ دونوں کا ماں بیٹے کا رشتہ معلوم

ہُوا۔ پھر تو مجھے یقین ہو گیا۔ یہی میرا ٹام خاں ہے۔"
ٹام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹام خاں!"

منٹا: "مُکرنے کی صلاح ہے؟"

ٹام: "بات ماں کے ہاتھ ہے۔ میرے انکار یا اقرار کی وقعت ہی کیا ہو سکتی ہے؟"

میری نے شہباز کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں نے آپ کو آج ہی دیکھا ہے۔"

منٹا: "ٹام انہیں کئی روز سے دیکھ رہے ہیں۔"

میری نے شہباز سے کہا۔

"میں خیال کر رہی ہوں۔ آپ نے سب سچ کہا ہے۔"

منٹا نے ٹام سے اور شہباز سے کہا۔

"آپ دونوں کو مبارک ہو"

میری ٹام سے بولی۔

"ذرا دیکھو تو۔ ان کے داہنے بازو پر کوئی نشان ہے"

شہباز: "اوہ اس کا تو مجھے خیال ہی نہ رہا۔"

بازو کھولتے ہوئے وہ بولا۔

"آپ نے مذاق میں کہا تھا نا۔ کہیں کھو نہ جانا نشان کر رکھو"
میں نے ہنستے ہوئے تم سے سوئی لی اور گود کر سرخی بھر دی۔
ٹام کے بھی تو تم نے ایسا ہی نشان کیا تھا۔ تم نے ہنستے ہوئے
کہا تھا "کہیں علیحدگی ہو جائے اور تم اسے پہچان ہی نہ سکو"
ٹام بھی اپنا بازو دکھوں رہا تھا۔ اس نے باپ کا نشان دیکھا۔
اور اپنا نشان اسے دکھایا۔ دونوں کے بازوؤں پر ایک ہی طرح کا
"K" کے تھا۔ ٹام نے جوش محبت میں باپ کا پیار لے لیا اور
اسے اپنا پیار دیا۔ پھر اس نے باپ کو گود میں اٹھا لیا اور ناچنا
شروع کیا۔ ٹام یہ گانا گا رہا تھا۔

"میرا ابا، میرا باپ، میری ڈیڈی، میرا بابا، میرا ڈیڈی، میرا ابا"
میری کہہ رہی تھی۔

"میں نے اپنے خان کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ جھٹ سے مان
لیتی۔ تو یہ برداشت نہ کر سکتے۔"

پھر ٹام نے باپ کو آہستہ سے لٹاتے ہوئے اس کا سر میری کی
گود میں رکھا اور کہا۔

"زندہ باپ سے کون پیار نہ کرے گا؟"

باپ کو لٹا کر اس نے ماں کا پیار لیا اور ماں نے اس کا بھر دہ بولا۔

"ماں۔ تم نے اپنا بیٹا منٹا کو دلوایا۔ منٹا نے تمہارے بیٹے کا آبا
تمہیں دلوا دیا۔"

شہباز اٹھکر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے باری باری سب پر نگاہ ڈالی
اور کہا۔

"کہیں یہ خواب ہی نہ ہو!"

میری:۔ "عزیز شوہر۔ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ منٹا بھی اپنی ہی ہے
آپ کے بیٹے ٹام خاں کی منگیتر ہے۔"

منٹا:۔ "خالہ جان۔ بوڑھا سہاگ مبارک ہو۔"

میری برسوں کے بعد سچی خوشی کی ہنسی ہنس رہی تھی۔ شہباز بیٹے
کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ٹام نے کہا۔

"آج ایک تصویر اکٹھی سب کی کھنچواؤں گا۔ ایک کاپی دادا
جان کو بھی بھیجوں گا۔"

میری:۔ "ہر ایک کا نام نیچے لکھنا۔ منٹا کے نام کے ساتھ "ٹام خاں کی منگیتر"
ضرور لکھنا۔ اور ہاں ایک کاپی مارتھا کو بھی بھیجیں گے۔ بیچاری
کیسی خوش ہوگی۔"

منٹا:۔ "اور نقلی ٹام کو نہیں بھیجو گے ٹام۔"

ٹام:۔ "ہاں ڈاسن شریر کو بھی اس تصویر کی ایک کاپی بھیجوں گا۔"

شہباز کو جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں اور ایک چھوٹی سی تصویر نکال کر ٹام کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو عزیز بچے۔ یہ آپ کے دادا جان کی تصویر ہے۔"

ٹام نے نظریں جما جما کر تصویر دیکھی اور پھر تصویر کو چوم کر کہا۔

"پیارا بڑا ابّا۔ یہ تو مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔"

یہ سُن کر منتا خوب ہنسی۔ شہباز اور میری بھی ہنس رہے تھے۔ ٹام اپنی بات پر خود ہنس رہا تھا۔

بیٹا اصغر

بیٹا اصغر!

میں وطن سے دور تھی - عزیزوں سے دور - سہیلیوں سے دور - میری غیر حاضری میں کئی ایک تقریبیں ہو گئیں - میری عزیز ترین سہیلی ریحانہ کی شادی بھی اسی عرصہ میں ہو گئی - شادی کی خبر پا کر میں خوش ضرور ہوئی - مگر شامل نہ ہو سکنے کا مجھے بے حد رنج تھا - میں اس کی شادی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہ جان سکی - کہ ایک کھاتے پیتے گھر میں وہ بیاہی گئی ہے - تفصیل لکھنے کی کسی نے ضرورت نہ سمجھی - نہ ہی ہم دونوں میں خط و کتابت کی رسم تھی کہ کچھ پتہ چلتا -

ریحانہ میری بچپن کی سہیلی - جوانی کی بھنیلی - پردیس میں اس کی یاد مجھے بہت ستاتی تھی - وہ ہے بھی بہت سی تعریفوں کی مالک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کا ایک حصہ ہے - وہ ہمدردی میں اپنا جواب آپ ہے طبیعت پر اس قدر قابو ہے کہ ہنستے ہنساتے ایک دم سنجیدگی

اختیار کرے گی۔ پھر لاکھ بہلانے کی کوشش کرو۔ گدگداؤ مگر اللہ کی بندی ٹس سے مس نہ ہوگی۔

میں وطن آئی تو سب سے مل ملا کر ریحانہ کے ہاں پہنچی۔ ریحانہ کا گھر بہت شاندار دیکھکر میں جی میں بہت خوش ہوئی۔ ڈیوڑھی بہت فراخ تھی۔ اس میں دائیں اور بائیں دو دو کمرے تھے۔ سامنے دو دروازے کھلتے تھے۔ میں نے پہچانا وہ دروازے اندر جانے کے ہیں۔ میں آہستہ آہستہ ڈیوڑھی میں سے گذر کر اندر جا رہی تھی۔ کہ دائیں طرف کے پہلے کمرے میں ایک خوش پوش آدمی نکلا۔ اندازے سے میں نے اسے ریحانہ کا شوہر جانا اور سلام کر دیا۔ اس نے خندہ پیشانی سے میرے سلام کا جواب دیا۔ پھر اس نے پکارا۔

"بیٹا اصغر خالہ کو اندر پہنچا دو۔"

بائیں طرف کے پہلے کمرے میں سے ایک نو دس برس کا خوش پوش لڑکا نکلا اور میرے ساتھ ہو لیا۔ میں لڑکے کے ساتھ جا رہی تھی اور جی میں سوچ رہی تھی "ریحانہ تو سوتیلوں کے قابل نہ تھی۔ یہ اصغر ہے تو کوئی اکبر۔ اصغری، اکبری، بھی ہوں گے۔ تیری رحمدلی نے رحم طلب مہیا کرئے مگر تیری خوش مذاقی کا کیا بنا؟"

میں اندر پہنچی ریحانہ نے دور ہی سے مجھے دیکھا۔ بھاگ کر

آئی اور بھینچ بھینچ کر ملی۔ پھر مجھے کھینچتے ہوئے اندر لے گئی اور کرسی میں پٹختے ہوئے بولی۔

"آپ تو ایسے گم ہوئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اور یہاں کیا کیا حادثے ہو گئے۔ وہ وہ انقلاب ہوئے۔ کہ توبہ ہی بھلی۔"

تقریبات کو وہ حادثے اور انقلاب کہہ رہی تھی۔ اس کی بات کا میں نے بھی ایسا ہی جواب دیا۔

"محصور جو تھی انقلاب کیسے روکتی؟"

ریحانہ کا گھر خوش نما اور آراستہ تھا۔ بظاہر وہ بہت ہی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ مگر میرے دل میں اس کے سوتیلے پن رہے تھے۔ اصغر پھر آیا اور ریحانہ سے اس نے پوچھا۔

"کچھ سودا بازار سے آئے گا؟"

ریحانہ نے کہا۔

"بازار سے کچھ نہیں آئے گا۔ میری بہن پیٹو نہیں۔"

اصغر چلا گیا۔ تو میں نے ریحانہ سے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔

"ایک اصغر ہی ہے یا کوئی اور بھی۔"

ریحانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اصغر ہی بہت ہے۔ لشکر کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے جی میں شکر کیا کہ ریحانہ لشکر سے بچ گئی اور اصغر اسے بُرا نہیں لگ رہا۔

ماما نے چائے لگا کر اطلاع دی۔ ریحانہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھانے کے کمرے میں لے گئی۔ چائے پر پھل، مٹھائی، کباب سب ہی کچھ تھا۔ ریحانہ نے مجبور کر کر کے مجھے بہت کچھ کھلایا پلایا۔ پھر ہم دونوں میں کافی دیر تک ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔

جب میں واپس ہونے کو ڈیوڑھی میں پہنچی تو دیکھا کہ باپ بیٹا اکٹھے چائے پی رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اصغر اٹھ کر میری طرف آ گیا اور پھر مجھے سوار کروا دیا۔ میرے دل میں اب بھی اس کے لئے تعصب بھرا تھا۔ ورنہ مجھے اس سے کہنا چاہئے تھا۔ "تم چائے سے اُٹھ کر کیوں آئے۔ میں خود ہی سوار ہو جاتی۔" مگر میں نے تو اس کے سلام کا جواب بھی ڈھیلے منہ سے دیا۔

اگلے دن ریحانہ ہمارے ہاں آئی۔ چائے پر ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ باتوں ہی باتوں میں مَیں نے ریحانہ سے کہا

"ریحانہ، میں اپنے بہنوئی کا فقط نام ہی جانتی ہوں۔ مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ وہ کام کیا کرتے ہیں؟"

ریحانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کون سے بہنوئی کا ذکر کر رہی ہو۔ میں نہیں جانتی آپ کی کتنی بہنیں ہیں اور کون کون آپ کا بہنوئی ہے؟"

میں:۔ "میں آپ کے شوہر ظہیر میاں کا پوچھ رہی ہوں۔ سمجھیں؟"

ریحانہ:۔ "آخر آپ کو یاد آ ہی گیا۔ کہ میں بھی ایک عدد میاں کی مالک ہوں۔"

میں:۔ "مناسب سمجھو تو بتا دو وہ کام کیا کرتے ہیں؟"

ریحانہ:۔ ہرگز غیر مناسب نہیں۔ کیونکہ وہ چوری ڈاکہ تو کرتے نہیں کہ بھید کھل جانے کا خوف ہو۔ اچھا وہ صبح اٹھکر ضروریات سے فارغ ہوتے ہیں۔ پھر ہوا کھانے نکل جاتے ہیں۔ واپس آ کر اخبار دیکھتے ہیں۔ پھر کھانے سے نپٹ کر آرام کرتے ہیں۔ تیسرے پہر ان کے دوست آ کر انہیں گھر سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ پھر جب جی میں آتی ہے آ کر پہنچ جاتے ہیں۔"

میں:۔ "کام کا ذکر آپ چھوڑ ہی گئیں۔"

ریحانہ:۔ "ہاں یاد آیا رات کو وہ اکثر چمگادڑوں سے شرط بدلا کرتے ہیں۔"

میں:۔ "کمانے نہیں جاتے؟"

ریحانہ:۔ "آپ کمائی کا پوچھ رہی ہیں؟ کمانے کہاں جائیں۔ وہ تو کما کر پیدا ہوئے تھے۔"

میں:۔ "آگیا سمجھ میں۔ باپ دادا کی املاک پر گذر ہے۔ تاہم مشغلہ تو کچھ رکھتے ہی ہوں گے۔"

ریحانہ۔ "بتا جو رہی ہوں۔ رات کو کبھی چمگادڑ معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی دیمک۔"

میں:۔ "میں نہیں سمجھی۔"

ریحانہ:۔ "کیا ہو گیا تمہاری سمجھ کو رات کو وہ کتابیں چاٹا کرتے ہیں۔ کبھی جی میں آئی۔ تو کچھ دھر بھی گھسیٹا۔"

میں:۔ "یوں کہو نا۔ وہ مصنّف ہیں۔"

ریحانہ:۔ "مصنّف ہونا اچھی بات ہے۔ تو مصنّف ہی سہی۔"

میں:۔ "ظہیر بھائی کی عمر کیا ہو گی؟"

ریحانہ نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"جب وہ پیدا ہوئے ہیں میں پاس نہیں تھی۔"

میں نے ریحانہ کو بتایا تھا۔ کہ میں تین چار دن ہی رہ سکوں گی۔ ریحانہ نے بات پلٹنے کو مجھ سے کہا۔

"بھئی۔ تم کیا آگ لینے آئی تھیں؟ آدمی وطن آئے اور

پندرہ بیس دن بھی نہ ٹھہرے۔"

میں "چھٹی کے لئے عرضی بھیج رکھی ہے۔ مگر منظور ہونے کی امید نہیں۔"

ریحانہ "ایسا جابر حاکم کہاں سے خرید بیٹھیں؟"

میں "تم سب نے مل کر چُنا تھا۔ میں نے بھی برخورداری بن کر منظور کر لیا۔"

ریحانہ: "سچ کہو جلدی کیوں جا رہی ہو؟"

میں: "میری خوش دامن کا جی ماندہ تھا۔ اس میں رُکی رہی۔ کچھ افاقہ ہوا تو میں نے سوچا مل ملا آؤں۔ جلدی اس لئے جا رہی ہوں کہ ان کی خبر گیری میرے سوا کون کر سکتا ہے۔"

ریحانہ: "بہت پختہ کار ہو۔ سوچا کہ بڑھیا چلتے چلاتے وقت لے گی۔ پھر رسموں کے لئے رُکنا پڑے گا۔ بھاگ کر وطن کو چھو آئیں۔"

میں: "اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ بہت اچھی ہیں بے چاری۔"

ریحانہ: "اچھی میں تو ان سے کہو سفر ملتوی کر دیں۔"

میں: "ایسے کام حاکم اعلیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں۔"

ریحانہ: "اپنے حاکم سے عرضی لکھوا کر حاکموں کے حاکم کے حضور بھجوا ہی نہ دو۔"

ادھر سے ماما ایک خط لے کر آئی۔ ریحانہ نے اس سے لے لیا اور کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ خط میرے شوہر کا تھا۔

" نورچشمی۔ ادنٰے لونڈی۔ راحت جان: ریحانہ کی خواہش معلوم کر کے ہم نے حاکموں کے حاکم کے پاس عرضی دی۔ وہ منظور ہو گئی۔ اس لئے آں عزیزہ کی عرضی ہم نے قبول کی۔ جتنا عرصہ چاہو ریحانہ کے پاس رہو۔ برخورداری اماں اب اچھی ہیں۔ تمہارا سعادت مند شوہر"

ہیں " ریحانہ۔ تم تو لے آٹا ملائے نمک گوندھ گئیں۔"

اس نے مصنوعی تیوری چڑھا کر خط میرے آگے ڈال دیا اور کہا " جو خود رکنا نہ چاہے اس کا علاج کیا۔ جاؤ برخورداری میں اجازت دیتی ہوں۔"

خط میں جلدی پہنچنے کی تاکید تھی۔ ریحانہ مجھ سے مل کر رخصت ہوئی اور میں نے جس جس سے ملنا ملانا تھا۔ مل ملا کر روانہ ہو گئی۔ جی میرا ابھی نہیں بھرا تھا۔ مگر کیا کرتی۔ بیماری والے گھر کا انتظام میرے سوائے چل بھی نہیں سکتا تھا۔

دو سال سے پہلے میں وطن نہ آسکی۔ جب آئی ہوں تو ریحانہ سے ملنے جانا ہی تھا۔ میں اس کے گھر گئی۔ تو پھر وہی قصہ ہوا۔ میں نے

ڈیوڑھی میں قدم رکھا ہی تھا کہ ظہیر صاحب نے پکارا۔

"بیٹا اصغر خالہ کو اندر پہنچا دو۔"

لڑکا آیا۔ اسے دیکھکر حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ ہڈیوں کی پوٹ تھا۔ اس کی رنگت سیاہی مائل زرد ہو گئی تھی۔ منہ پر چھائیاں پڑی تھیں اور پھنسیوں کے نشان بھی۔ میں جی میں کہہ رہی تھی۔

"آخر سوتیلی کا سوتیلاپن رنگ لایا ہی۔ کیا حال ہو گیا ہے بیچارے کا"

ریحانہ حسب عادت مجھ سے نہایت تپاک سے ملی۔ مگر میں اب اس سے کھل کر بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میری نگاہوں میں اب وہ اونچی عورت نہیں رہ گئی تھی۔ میں اس وقت اپنے گھر میں ہوتی تو لڑکے کی حالت پر رو اٹھتی۔ وہ اس کی سفید رنگت اور گالوں پر سرخی کی جھلک۔ وہ اس کا بھرا بھرا بدن۔ ڈھانچ ہے اب تو۔

ریحانہ کی گود میں سال بھر کا بچہ تھا وہ اس کی ٹوٹی پھوٹی باتوں پر کھلی جا رہی تھی۔ میں نے جی میں کہا۔

"اپنا دیکھا نہیں تھا۔ تو شوہر کے بچے ہی کو اپنا کر کے رکھا تو بہ ہے اپنا دیکھتے ہی شوہر کا بچہ سوتیلا ہو گیا!"

قریب ہی راشد الخیری کی ایک کتاب تپائی پر کھلی دھری تھی۔

میں نے خیال بدلنے کو اٹھالی۔ سامنے وہی مضمون تھا جس میں سوتیلی نے شوہر کو بہکا کر سوتیلے کو گھر سے نکلوا دیا تھا۔ ریحانہ کنوارپنے میں ایسے مضمون پڑھکر دھاڑ دل رد یا کرتی تھی۔ مگر اب یہی کچھ سیکھنے کی ضرورت محسوس کر رہی ہے۔ کس قدر بدل سکتا ہے انسان۔ ایک رحم طلب قصہ تھرطلب بنایا جا سکتا ہے۔ یہ وہی ریحانہ ہے۔ لڑکے کو اس حالت تک پہنچا کر بھی تسلّی نہیں"

میں کتاب ہاتھ میں لئے اپنے خیالوں میں گم تھی۔ ریحانہ کی آواز نے مجھے ہوشیار کیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"میں ذرا باورچی خانے ہو آؤں"

اس کے جانے پر میں پھر وہی کچھ سوچ رہی تھی۔

"ریحانہ کی طرح اصغر کی ماں بھی اس گھر کی مالک تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا گھر باہر۔ شوہر۔ بیٹیا۔ سب کچھ کسی اور کا ہو جائے گا اور اس کا لخت جگر ایک رحم دلی کی ڈینگیں مارنے والی لڑکی کے ہاتھوں یوں ستایا جائے گا"

کھلی کتاب اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ ریحانہ واپس آئی۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کتاب آپ لے جا سکتی ہیں"

میں:۔ مجھے ایسی کتابوں کی ضرورت کیا ہے؟"

ریحانہ:۔ میں نے جانا گھر سے آپ یہ کتاب دیکھتے ہی چلی تھیں"۔

ریحانہ ہنسے جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں۔ اب اس مضمون سے آپ کیا سیکھ رہی ہیں؟"

ریحانہ پہلے تو میرا منہ تکتی رہی۔ پھر کہا۔

"ایسے مضمونوں سے سوائے افسوس کے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے؟"

میں:۔ کتاب یہیں سے کھلی دھری تھی"

میں نے اسے ویسے ہی تپائی پر رکھدیا۔ اور لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔

چائے لگنے کی اطلاع پر ریحانہ مجھے ادھر لے گئی۔ ایک پیالی بنا کر میری طرف بڑھائی۔ دوسری تیار کر کے خود پینے لگی۔ میں خالی چائے پی رہی تھی۔ ریحانہ نے میری پلیٹ میں مٹھائی بھرتے ہوئے کہا۔

"لڑکی۔ آج گھر سے لڑ کر پڑھنے کو آئی ہے؟"

وہ ہنس رہی تھی۔ مگر میں مسکرا بھی نہ سکی۔ اور آہستہ آہستہ مٹھائی کھانے لگی۔ کیا دیکھتی ہوں۔ اصغر ریحانہ کے بچے کی ہاتھ گاڑی کھینچے چلا آ رہا ہے۔ بچہ سو گیا تھا۔ اصغر نے اسے اٹھا کر آرام سے

پلنگڑی میں لٹا دیا اور گاڑی ایک طرف لگا کر جانے لگا۔ ریحانہ نے اس سے کہا۔

"تمہارے لئے دلیہ پکا رکھا ہے۔ باورچی خانہ کے برآمدے میں بیٹھ کر کھا لو۔ دلئے کے آدھ گھنٹہ بعد دوائی پی لینا۔ صاحب کے جوتے بھی صاف کرنے ہیں۔ بھولنا نہیں۔"

"اچھا جی" کہہ کر وہ چلا گیا۔

مجھے پتہ ہی نہیں چلا وہ کس وقت بچے کو سیر کروانے لے کر گیا تھا جب وہ واپس آیا۔ تو میں نے جی میں کہا۔

"بے چارہ نوکر بن گیا۔ باپ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ دلیہ کھائے وہ بھی باورچی خانے کے برآمدے میں بیٹھکر۔ ابھی تک باپ اسے بیٹا کہہ رہا ہے۔ کسی دن یہ فرق بھی جاتا رہے گا اور وہ بھی اسے بوائے یا چھوکرے پکارنے لگے گا۔"

چائے کی خالی پیالی رکھتے ہوئے میں ریحانہ سے پوچھ بیٹھی۔

"ریحانہ۔ ظہیر صاحب کی پہلی بیوی کہاں کی تھی؟"

ریحانہ نے غصے اور حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ پھر کہا۔

"میں نے انہیں کنوارا ہی سُنا ہے۔ شاید مجھے ہی بے خبر رکھا گیا ہو۔"

میں حیران تھی۔ سوتیلا آنکھوں کے سامنے موجود ہو۔ پھر بے خبری کا مطلب کیا ہوا۔

میں نے انگڑائی اور جمائی ایک ساتھ لی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ریحانہ بولی۔

"آپ جا رہی ہیں۔ چلئے میں آپ کو پہنچا آؤں۔ بچہ سو ہی گیا ہے۔ جاگ گیا تو لڑکا اور ماما سنبھال سکتے ہیں۔"

ہم دونوں باہر نکل کر سوار ہوئیں۔ اصغر ہدایات لینے گاڑی کے پاس آیا۔ ریحانہ نے اس سے کہا۔

"چھوٹے بھیا کا دھیان رکھنا۔ میں بہن کے ساتھ جا رہی ہوں۔ صاحب آئیں تو انہیں بتا دینا۔"

گاڑی روشن آرا باغ کی طرف جا رہی تھی۔ میں شام کو اکثر ادھر جایا کرتی ہوں۔ میں نے اسے گاڑیبان کی سمجھداری سمجھا کہ خود ہی ادھر چلنے لگا ہے۔ میں اس وقت سمجھی جب گاڑی ریحانہ کے میکے کے دروازے پر جا کر رک گئی۔ کہ اسے ریحانہ نے حکم دیا ہے۔ پوچھا تو وہ بولیں۔

"ہاں! میں نے ہی اسے اس طرف آنے کا کہا تھا۔ تم تو گم رہنے لگیں۔ نہ جانے کیوں۔ چلو تمہیں اماں سے ملوا دوں۔"

میں نے جی میں کہا۔

"مجھ سے پوچھے بغیر یہ مجھے ادھر لے آئی۔ تو ضرور ماں سے سوت کا پوچھنے کا سوچا ہے۔ اگر واقعی یہ بے خبر رکھی گئی ہے۔ تو اس کی ماں مجھ سے نہ پوچھے گی :- لڑکی تو نے کہاں سے سُنا۔ میرے پاس کیا جواب ہے ؟"

میں اترنا نہیں چاہتی تھی۔ ریحانہ نے کھینچ گھسیٹ مجھے اترنے پر مجبور کیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

" بہن خالہ سے ڈرتی کیوں ہو۔ وہ پیٹیں گی تھوڑے ہی۔"

گویا میں مجرم ضرور ہوں۔ اب چھوٹی بچی نہیں۔ اس لیے پٹ نہیں سکتی۔

اندر پہنچ کر ریحانہ نے ماں کو آداب کر کے کہا۔

" اماں دیکھئے۔ یہ بھی آئی ہیں میری سوت کی سگی۔"

یہ سنتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ ریحانہ بات ضرور دہرائے گی۔ اپنا آپا سنبھال کر میں نے بھی خالہ کو آداب کیا۔

وہ بولیں۔

" تم کدھر سے بھول پڑیں، اچھی تو ہو۔"

میں :- آپ کی دعا سے اچھی ہوں۔"

ہم دونوں خالہ کے پاس قالین پر بیٹھ گئیں۔ میں کسنا کھول چھالیہ کترنے لگی۔ ریحانہ کا ہونٹ مسکرانے کو بھی ہلتا تو میں سمجھتی۔ ابھی بات چھیڑے گی۔ دو تین ٹکڑے چھالیہ کے جو کسنے میں باقی تھے کٹ گئے تو میں نے اور چھالیہ پوچھیں۔

خالہ بولیں "مقبول لینے گیا ہے۔ آتا ہی ہو گا۔ یہ کہو کہ کھاؤ گی کیا؟"

میں:۔ ریحانہ نے بہت کھلا دیا ہے۔ پیٹ میں جگہ نہیں ہے۔"

خالہ:۔"میکے میں تکلف کرنا کہاں سے سیکھ آئیں؟"

ریحانہ:۔"سنگترے ہوں تو کھلا دیجئے۔"

خالہ نے سنگترے ہمارے آگے رکھوائے۔ ہم دونوں کھاتی رہیں پھر خاصدان میں سے پان اٹھا کر میں نے خالہ کو آداب کیا۔ پان منہ میں ڈال میں نے ان سے اجازت مانگی۔ وہ بولیں۔

"اے۔ تم چھدّا اتارنے آئی تھیں؟"

ریحانہ "جی کو چین ہو تو بیٹھیں بھی۔ اب گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔"

ریحانہ مجھے بات بات میں پکڑے جا رہی تھی۔ خالہ نے کہا۔

"خدا نہ کرے بے چینی کیسی؟"

ابھی ریحانہ نے کچھ جواب نہیں دیا تھا کہ ایک حیران کرنے والی بات اور ہو گئی۔ سامنے کے دروازے میں سے ایک لڑکا چلا آرہا تھا۔ عین میں اسی شکل کا جیسا میں نے ریحانہ کے گھر میں پہلے دن اصغر بیٹا دیکھا تھا۔ خالہ نے اس سے کہا۔

"مقبول چھالیہ لینے غازی آباد گیا تھا"

لڑکے نے کہا۔

"یہ دیکھئے میری بغل میں کیا ہے؟ میاں مل گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔

"بیٹا اصغر میں سفید کاغذ خرید کر آیا ہوں۔ دوکان پر سے لاکر مجھے ابھی پہنچا دینا"

کاغذ لے آیا ہوں۔ سوچا پہلے چھالیہ دیتا جاؤں۔ اب کاغذ پہنچانے جاتا ہوں"

لڑکا چلا گیا اور میں سوچتی رہ گئی۔

"کاغذ یقیناً ظہیر بھائی نے منگوائے ہیں اور ان کا اصغر بیٹا دینے گیا ہے۔ یہ لوگ اسے مقبول کہہ رہے ہیں معلوم نہیں کیوں؟ ادھر گھر میں ایک بیٹا اصغر بیٹھا ہے"

اچانک مجھے سوجھی ۔ "ظہیر صاحب کا خاندانی نام اصغر ہے۔ وہ خود ظہیر اصغر۔ یہ مقبول اصغر۔ اسی طرح کا اس لڑکے کا نام ہو گا۔ جو گھر میں بیٹھا ہے۔ ریحانہ کے اپنے بچے کا بھی اسی قسم کا نام ہو گا"

خالہ باورچی خانہ کی طرف گئی تھیں ۔میں نے ریحانہ سے کہا۔

" ریحانہ تم نے اپنے بچے کا نام مجھے بتایا ہی نہیں"

ریحانہ ۔" آپ نے پوچھنے کی زحمت کب گوارا کی تھی ۔اب اس کا نام تم ہی رکھ دو ،خالہ جو ہو "

میری سوجھ کو یہاں سہارا نہ ملا ۔میں نے اب پوچھا۔

"ظہیر صاحب کا اپنا پورا نام کیا ہے ۔شاید ظہیر اصغر ہے "

ریحانہ ۔" نہ ۔ان کا نام ظہیر احمد ہے "

میرا بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہ گیا ۔ اور میں منہ اوندھا کر بیٹھ گئی۔

ریحانہ نے جیسے مجھے چڑانے کو پوچھا۔

"کیا سوچ رہی ہیں جناب ؟"

میں :" کچھ بھی نہیں "

ریحانہ ۔" مکرنے سے فائدہ ؟"

میں :" خالہ آئیں تو اجازت لوں "

ریحانہ ۔" مجھے یہیں چھوڑ جاؤ گی اور دماغی الجھنیں ساتھ ہی

لے کر جاؤ گی!"

میں :"تم ہی کہو کیا کروں۔ دماغی اُلجھنیں میرے بس میں کیسے ہوں؟"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور کہا۔

"ماں گئیں بے چاری۔ کہ دماغ میں اُلجھنیں بھری رکھی ہیں میری سوت بھی اسی بھیجے میں اٹکی بیٹھی ہے۔ اور معلوم نہیں کتنے میرے سوتیلے بھرے پڑے ہیں"

میں :"اچھا ایک بات بتاؤ۔ اصغر ایک سے دو کیسے ہو گئے؟"

ریحانہ :"دو آپ نے دیکھے ہیں نا۔ کیا خبر کتنے ہیں؟"

میں :"سب اصغر ہی ہیں؟"

ریحانہ :"اور کیا؟"

اتنے میں خالہ آ گئیں۔ ریحانہ نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔

"میں منت کرتی ہوں کہ اپنی خالہ سے میری فریاد نہ لگانا۔"

ریحانہ ہنسی دبا رہی تھی۔ اس نے ماں سے کہا۔

"اماں بی۔ آپ کی بھانجی شکایت لئے بیٹھی ہیں۔

خالہ نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بانو؟"

مجھے ریحانہ پر غصّہ آرہا تھا۔ وہ مجھے دِق کررہی تھی میں خالہ کی بات کا جواب نہ دے سکی۔ میرے پاس کیا جواب تھا۔

ریحانہ نے کہا۔

"اماں بی۔ یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ میرے کتنے سوتیلے بیٹے اصغر ہیں؟"

خالہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"نوج! تمہارے سوتیلے کیوں ہوں؟"

پھر مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔

"بیٹیا۔ ان کے میاں کی عادت ہے۔ چھوٹے لڑکے کو وہ بیٹیا اصغر کہہ کر پکارتے ہیں۔"

میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے ریحانہ کے کندھے پکڑکر اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے یوں ہی ہلکان کیا۔

ریحانہ۔" خود تو بات کے بتنگڑ بنائے۔ میں نے کیا کیا ہے؟"

خالہ کے جا رہی تھیں۔

"میرا نوکر بیماری کاٹ کر اٹھا ہیں نے اسے ان کے ہاں بھیج دیا کہ ان کے ہاں اس کی پروا ہو گی۔ جلدی طاقت پکڑے گا۔ مقبول کو تھوڑے دنوں کے لئے بلوا لیا۔ بیٹا ان کے ہاں نوکر کو گھر کے آدمی کی طرح رکھتے ہیں۔

د۔ ب۔ سلیم